گفت و شنید

بشیر احمد ہاشمی

اُردو اکیڈمی لاہور

کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس (ایبٹ روڈ) لاہور میں باہتمام لالہ گوراندتا کپور
مینجر چھپی اور میاں محمدؐ حنیف مالک اردو اکیڈیمی لاہور نے شائع کی

اُس پیکرِ شفقت کے نام

جس کی اَدب آموز آغوش میں

ایک مضغہ گوشت کلام و بیان

کی نعمت سے سرفراز ہوُا

محروم

ہاشمی

ریڈیو کے لئے مضامین لکھنا اب کم و بیش ایک فن کی صورت اختیار کر چکا ہے۔
اس فن کی ایک اہم خصوصیت ارتجال ہے جسکو بالفاظ دیگر ہتھیلی پر سرسوں جمانا کہہ سکتے ہیں
اربابِ ریڈیو کسی موضوع کا تعین کر دیتے ہیں، آپ ان کی نظر انتخاب کی داد دیتے ہوئے
اور اہمیت زر کی تفسیر تحت اللفظی کرتے ہوئے اس موضوع پر خامہ فرسائی کرنے کے لئے تیار
ہو جاتے ہیں، کم سے کم مدت میں، نہایت سطحی غور و خوض اور قلیل سے قلیل مطالعے کے بعد ایک
مضمون تیار ہو جاتا ہے جو مقررہ وقت پر کسی نشر گاہ سے ریڈیو کے سننے والے مظلومین کی
ضیافت سمع، کا باعث ہوتا ہے۔

اس مجموعے کے بیشتر مضامین بھی آل انڈیا ریڈیو لاہور سے نشر کئے جا چکے ہیں، مجھے
اپنی فرومائگی اور ان مضامین کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہے اور بظاہر کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی
کہ انہیں کتاب کی صورت میں پیش کیا جائے لیکن احباب کے اصرار کی تعمیل میں، یہ مجموعہ شائع
کیا جا رہا ہے، مجھے امید ہے، جو لوگ خندہ پیشانی سے ریڈیو کی تقاریر سن سکتے ہیں وہ ان مضامین
کو بھی برداشت کر سکینگے۔

لاہور - ۱۵ - مئی ۱۹۴۳ء

بشیر احمد ہاشمی

فرنگی اُردُو

فرنگی اُردو

لسانیات کی مستند قاموس میں فرنگی اردو کی حسبِ ذیل تعریف درج کی گئی ہے

اوّل اردو سے ملتی جلتی ایک بولی ہے جس کو فرنگی اردو سمجھ کر بولتے ہیں۔

دوم انگریزی سے ملتی جلتی ایک بولی ہے جسے مغرب زدہ ہندوستانی فرنگی حکّام کی زبان سمجھ کر بولتے ہیں۔

سوم وہ مخلوط بولی ہے جسے کالج کے طلبا اور بزعمِ خود تعلیم یافتہ افراد اپنی مادری زبان سمجھ کر بولا کرتے ہیں۔

اس قاموس کے فاضل مصنّف نے فرنگی اردو پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر ہندوستان جنت نشان میں سودا سلف بیچنے کے لئے وارد ہوئی تھی۔ اور جس طرح حضرت موسیٰ کوہ طور پر آگ لینے گئے تھے اور پیغمبری لے کر لوٹے تھے اسی طرح کمپنی بہادر بھی اسباب تجارت لے کر آئی اور حکومت سنبھال کر بیٹھ گئی۔

دنیا کا دستور ہے تاجر گاہک کی زبان میں بات چیت کرتا ہے چنانچہ کمپنی کے گماشتوں نے بھی فارسی زبان کو اپنی کاروباری زبان بنایا۔ مگر مغلوں کے اقتدار کے ساتھ فارسی کی آبرو کم ہوتی چلی گئی۔ اور آخر کار ایک وہ زمانہ آگیا کہ مغلئی دربار میں بھی ریختہ کا سکہ چلنے لگا۔ قصہ مختصر ۱۸۵۸ء میں جب بادشاہی کام بادشاہوں کے سپرد ہوا اور فرنگی سوداگروں نے انگلستان کی ملکہ کو قلمروِ ہند کا حاکم بنا دیا۔ اس وقت ریختہ یعنی اُردو جو مغلوں کے ادبار کی آخری یادگار تھی، خوب بن سنور چکی تھی لیکن فرنگی کام و دہن سے اجنبی ہونے کے باعث وہ اس قابل ہی تصور نہ کی گئی کہ زیادہ منہ لگائی جائے، بہر حال وہ ملک کی زبان تھی، اور فرنگی کے لئے اس کا بولنا کم و بیش ناگزیر تھا۔ قصہ مختصر حاکم فرنگی اور محکوم اردو میں کچھ رشتہ اور تعلق پیدا ہوا۔ حاکم بے پروا اور پندارِ حکومت لئے ہوئے، اور محکوم اردو مغل بادشاہوں کی گودوں میں کھیلی ہوئی، اس لئے خودسر اور پُر تمکنت، آخر کار فریقین میں کچھ کچھ مصالحت ہوئی۔ فرنگیوں نے اردو بولنے والے شاگرد پیشہ لوگوں سے ان کی بولی سیکھی۔ اور اس میل جول سے جو زبان پیدا ہوئی اس کے لئے فرنگی اردو کا نام تجویز ہوا۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس بولی میں اکبر الہ آبادی کے ٹھٹھول سے قطع نظر نظم و نثر نہیں لکھی گئی۔ تاہم اس کا رواج اچھا خاصہ بڑھ گیا۔ صاحب لوگ اور ان کے ملازمین تو یہی بولی بولتے تھے لیکن فرنگی بارگاہ کے متوسلین یعنی یہی کچھ کالے صاحب

لوگ بھی اس بولی کے گرویدہ ہو گئے۔ بات یہ ہے صاحبیّت بنگلہ۔ بیرا۔ بُوٹ اور ہیٹ، مٹن چاپ اور پُڈنگ تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ یہ کام و دہن سے رگ و پے تک میں سرایت کر جاتی ہے۔ ان صاحب لوگوں نے اردو میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ یعنی فرنگی محاورات کو بے لاگ اردو میں ترجمہ کیا۔ مگر مشرق و مغرب کا لسانی خمیر کچھ ایسا مختلف واقع ہوا ہے کہ یہ چیز شیر و شکر کی طرح ایک جان نہ ہو سکی، نہ صرف یہ بلکہ اس میں گنگا جمنی چھب بھی پیدا نہ ہوئی۔ اس مخلوط الجنس بچہ کا روپ کچھ بے ڈھب ہی رہا۔ گویا

سر بباز کا منہ لُون کا اچور کی گردن

باوجودیکہ ہر جانور بھانت بھانت کی بولیاں بولتا رہا مگر لذت سے خالی کسی کی بولی نہ تھی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں فرنگی میں پندار بہت زیادہ ہوتا ہے جیسے ہر چیز میں اسے درک ہے اور ہمہ دانی اس کا دعویٰ۔ چنانچہ اردو نظم و نثر میں بھی فرنگیوں کو بہت کافی دخل بلکہ خلل رہا ہے۔ ایسے ہی ایک فرنگی کا قصّہ سُن لیجئے۔ اس کے راوی استاد ذوقؔ مرحوم ہیں۔

استاد ذوقؔ فرماتے ہیں "مجھے ایک دن بادشاہ نے اپنی غزل کا مسودہ دیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ اسے ابھی بنا دو۔ برسات کا موسم تھا۔ گھٹائیں تلی کھڑی تھیں دریا

اپنی مشہور و معروف تصنیف "ابن الوقت" میں میاں ابن الوقت اور نوبل صاحب کی ملاقات کا حال اس طرح لکھا ہے :-

ایک دن ابن الوقت نوبل صاحب سے ملنے گئے۔ کشاکشِ سگ چپراسیاں اور ذلّتِ نفس کے بعد نوبل صاحب کے حضور میں باریاب ہوئے۔ وہاں بیٹھے چند منٹ گزرے ہونگے کہ چپراسی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "خداوند! سررشتہ دار حاضر ہے" صاحب نے فرمایا۔ "اَچّا آنا بولو" یعنی اچھا سررشتے دار سے کہو چلے آئیں۔

سررشتہ دار کے روبرو صاحب ابن الوقت سے پھر مخاطب ہوئے۔ "ول سررشتہ دار گرمی" اب سررشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کر کاغذ پھیلا رہا ہے۔ اور ابن الوقت اور صاحب کی یہ پُر تپاک ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں چپ چپ جب سررشتہ دار کاغذ پھیلا چکا۔ تو لگا صاحب کا منہ دیکھنے۔ اس وقت صاحب ابن الوقت سے یوں مخاطب ہوئے۔ "آپ کُچھ کُچھ" یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے۔ مطلب ملاقات ختم۔ حق یہ ہے کہ دانایانِ فرنگ کے احسانات اردو پر بے شمار ہیں اور ان کا سلسلہ ابھی تک برابر جاری ہے۔

کوئی بارہ تیرہ سال ہوئے ہیں ایک دن لندن میں ڈاکٹر سٹوری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر رہ چکے تھے

بھی چڑھاؤ پر تھا۔ میں دیوانِ خاص میں جاکر دریا کے رخ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ مڑکر دیکھا تو ایک صاحب دانائے فرنگ کھڑے تھے۔ مجھ سے کہا "ول آپ کیا لکھٹا ہے" میں نے جواب دیا "غزل ہے" پوچھا "آپ کون ہے"۔ میں نے کہا "نظم میں حضور کی دعاگوئی کرتا ہوں" فرمایا "کس جبان میں"؟ میں نے کہا "اردو میں"۔ پھر پوچھا "آپ کون کون جبان جانٹا ہے" میں نے کہا "عربی فارسی بھی جانتا ہوں" دریافت کیا "آپ انگریزی بھی جانٹا ہے"؟ میں نے کہا "نہیں" فرمایا "کیوں نہیں سیکھا"؟ میں نے کہا "ہمارا لب و لہجہ اسے قبول نہیں کرتا" صاحب نے کہا "ول یہ کیا باٹ ہے ہم آپ کا جبان بولٹا ہے" میں نے جواب دیا "جناب! پختہ سالی میں غیر زبان سیکھنی بہت مشکل ہے۔" انہوں نے پھر کہا "ول ہم آپ کا ٹین جبان ہندوستان آکر سیکھا آپ ہمارا ایک جبان نہیں سیکھ سکٹا"۔ میں نے کہا۔ آپ فرماتے ہیں "ہم آپ کا ٹین جبان ہندوستان آکر سیکھا آپ ہمارا ایک جبان نہیں سیکھ سکٹا"۔ "بھلا یہ بھی کیا زبان ہے اور کیا سیکھنا ہے۔ اسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے اسے تو زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں"۔

ایک دانائے فرنگ کا قصّہ آپ نے استاد ذوقؔ کی زبانی سن لیا۔ اب مولوی نذیر احمد مرحوم کی زبانی نوبل صاحب کی گہرافشانی ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی صاحب نے

ان دنوں انڈیا آفس کی لائبریری کے لائبریرین تھے۔ ایک انگریز بزرگ تشریف لائے میں ان کا نام اور پتہ عرض کرنے سے معذور ہوں۔ البتہ اتنا ضرور عرض کرسکتا ہوں کہ وہ اردو اور ہندوستان کی کئی اور زبانوں کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ صاحب نے مزاج پرسی کے دوران میں بے تکلف ارشاد فرمایا "آپ کا مزاج شریف ہے؟" اب آپ ہی فرمائیے میں سوائے ایک احمقانہ مسکراہٹ کے اس استفسار کا اور کیا جواب دے سکتا تھا۔

اسی طرح کا ایک لطیفہ اور سن لیجئے۔ ایک صاحب کسی دیسی کے ساتھ ریل میں سفر کر رہے تھے، گاڑی کسی سٹیشن پر ٹھیری۔ صاحب نے دیسی ہم سفر سے بے تکلفانہ دریافت کیا "اس سٹیشن کا اسم شریف؟"

ایک مشنری فرنگن دہلی کے ایک زنانہ مدرسہ میں کوئی دس بارہ سال سے پڑھایا کرتی تھیں اور لطف یہ ہے کہ اردو انہوں نے باقاعدہ پڑھی تھی۔ ہمارے ہاں بھی ان کا آنا جانا تھا۔ ہم لوگوں کی زبان سے انہوں نے اکثر یہ فقرہ سنا تھا "آئیے بس صاحب تشریف رکھئے"!

سننے میں یوں آیا ہے ایک دن وہ کسی لڑکی پر سبق یاد نہ کرنے کے باعث بہت خفا ہوئیں۔ اور غصہ میں ارشاد فرمایا "تمہاری تشریف پر اتنے بید لگاؤں گی

کہ عمر بھر یاد رکھو گی"۔

ان باکمال بزرگوں کو چھوڑیئے دو چار نمونے عام آدمیوں کے ملاحظہ فرمائیے:۔

ایک میجر صاحب اس بات پر ہمیشہ غور کیا کرتے تھے کہ ہمارا دھوبی کرنیل صاحب اور کپتان صاحب کے کپڑے ہمیشہ گدھے پر لاد کر لاتا ہے اور ہمارے کپڑے سر پر اٹھا کر آتا ہے۔ آخر سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس بات میں ہماری سخت ہتک ہے۔ دوسرے روز ان کا دھوبی سر پر کپڑے اٹھائے کوٹھی میں داخل ہوا۔ صاحب تو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ فرمانے لگے ڈیکھو ڈھوبی۔ کرنل صاحب گڈھا۔ کپتان صاحب گڈھا۔ ہم گڈھا کیوں نہیں۔ دھوبی سمجھ دار تھا۔ ایک ٹھوکر کھاتے ہی بھید کو پا گیا۔ اور گڑگڑا کر بولا۔ اب سے آپ بھی گدھا۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ میجر صاحب بولے بہت ٹھیک۔ اب معاف کر ڈیگا۔ بٹ باڈ رکھو ہم بھی گڈھا۔

یہ تو باتیں ہیں ان لوگوں کی جو اصلاً اور نسلاً فرنگی ہیں۔ لیکن ہندوستان کے رہنے والے بھی جب دو چار سال انگلستان میں رہنے کے بعد واپس ہندوستان آتے ہیں تو وہ بھی ان صاحبوں سے کم فرنگی اردو نہیں بولتے۔

میرے ایک دوست آکسفورڈ سے تکمیل تعلیم کے بعد وطن آئے۔ ایک روز شام کو بیٹھے چاء پی رہے تھے چاء ذرا ہلکی تھی اور وہ تیز چاء کے عادی۔ بولے بھئی میں تو مضبوط

چاء پیو‌ئنگا۔ گویا سٹرونگ ٹی کا ترجمہ فرمایا اور تہی مایہ اُردو کے دامن کو محاورہ اور معنی کی دولت سے مالامال کر دیا۔

جب ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان سے میل کھاتے ہیں تو ان کا تلفظ ذرا تبدیل ہو جاتا ہے اور فرنگی اردو میں تو اکثر اوقات اصلی ناموں کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ بچپن میں میرے ایک ہم جماعت تھے سب دوست انہیں مجید مجید کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ بی۔ اے ہوتے تک مجید صاحب کا نام محمد عبدالمجید لودھی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم دونوں بچھڑ گئے اور خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچے تقریباً پندرہ برس بعد زمینداری کے ایک قضیئے میں مجھے صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی عدالت میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا معلوم ہوا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب کا نام مسٹر اے۔ ایم لاڈی ہے لیکن صاحب کے روبرو پیش ہونے پر یہ بھید کھلا

کہ بورانی ست بادنجاں و بادنجان بورانی

یعنی محمد عبدالمجید لودھی کو فرنگی اردو میں اے۔ ایم۔ لاڈی کہا جاتا ہے خیر یہ بالکل اتفاق کی بات ہے کہ نام کے ساتھ صاحب کا مزاج نہ بدلا تھا۔ انہوں نے خاص کرم فرمایا کہ مجھے پہچان لیا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ فوراً اپنے چپراسی کو پکارا اور فرمایا ڈیکھو صاحب کے لئے آرام کرسی پکڑو اور بنگلہ پر جاؤ۔ گگ کو بولو۔ لنچ پر صاحب ہمارے ساتھ ہو گا۔

میں اسی روز دہلی واپس جا رہا تھا۔ لیکن مسٹر لاڈی نے مجھے زبردستی روک لیا۔ بہت رات گئے تک ہم دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے، اس لئے صبح کو خلاف عادت میں دیر تک سوتا رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو مسٹر لاڈی نہایت پُر رعب فرنگی اردو میں فرما رہے تھے۔ "ول ڈیکھو چھوٹا حاضری سے پہلے صاحب کا گُسل لگا ڈینا۔ اور ہمارا ایک ڈم شیو لگاؤ۔ ہمارا نیلا سوٹ لگاؤ۔ اور ڈیکھو ہمارا کالا جوتا لگاؤ۔ ہم چھوٹا حاضری کے بعد گُسل لیگا"۔

کہاں ہیں وہ لوگ جو فرنگی اردو کے اختصار اور ایجاز کے قائل نہیں۔ غور فرمائیے ایک لگا دینا کتنی صورتوں میں جلوہ گر ہے۔ شیو لگا دینا۔ غسل لگا دینا سوٹ لگا دینا جُوتا لگا دینا۔

لطیفہ یہ ہے کہ مسٹر لاڈی مجھ سے اچھی خاصی اردو میں بات چیت کرتے لیکن اپنے ملازموں سے فرنگی اردو میں بولتے تھے۔

مضمون طویل ہو گیا۔ مگر ابھی دفتر کے دفتر پڑے ہیں۔ کیا کروں ٹائم شارٹ ہے اور مضمون بہت انٹرسٹنگ۔ ریڈیو والے اپنی رسپانسبلیٹی سے مجبور ہیں اور میں اس سے زیادہ بریف اور ٹرس لکھ نہیں سکتا۔ بہر حال نٹ شل میں بات یوں ختم ہوتی ہے کہ

پرا

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلّوری ہیں یاں ایک پُرانا مٹکا ہے

بیرا

میں کوئی بزدل آدمی نہیں ہوں، بلکہ میرے اکثر دوستوں کا خیال ہے کہ میں صاف گو اور بہادر انسان ہوں، لیکن حضرات! بہادری اور صاف گوئی کے یہ معنی نہیں کہ انسان بیوقوف اور منہ پھٹ بن جائے۔ اس لئے میں ہمیشہ پہلے بات کو خوب تولتا ہوں پھر منہ کھولتا ہوں۔

آپ اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے ریڈیو سُن رہے ہیں۔ ممکن ہے آس پاس آپ کا بیرا بھی موجود ہو۔ اگر ذات شریف موجود ہیں تو انہیں کہہ دیجیے کہ وہ تشریف لے جائیں اور آرام سے اپنے دوستوں میں بیٹھیں۔

اگر صاحب بہادر اور میم صاحب کلب گئے ہوئے ہیں اور بیرے صاحب ریڈیو سُن رہے ہیں تو میں ان سے عرض کرتا ہوں کہ بھیا بیرے تم یہاں کہاں، باورچی خانے میں جاؤ اور خانساماں سے ادھر ادھر کی باتیں بناؤ۔ قصہ مختصر میں نہیں چاہتا کہ

کوئی بیرا میری گفتگو سنے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں بیروں کے خلاف کچھ کہنے والا ہوں، میری یہ مجال اور یہ طاقت۔ میں اپنے مشفق اور کرم فرما کے متعلق بھلا کوئی ایسی ویسی بات کہہ سکتا ہوں؟

میرے موضوعِ سخن کا عنوان بیرا ہے۔ وہ بہرا نہیں جو کم سنتا ہے یا اُونچا سنتا ہے یا بالکل نہیں سنتا، آپ کہتے ہونگے' یہ بیرا کس زبان کا لفظ ہے۔ جناب یہ اُسی زبان کا لفظ ہے جس میں مذکر اور مؤنث کی تمیز نہیں۔ جس زبان میں ناشتہ کو حاضری، بچے کو بابا لوگ، بچی کو مس بابا، بیگم صاحب کو میم صاحب، اور آپ کو یا مجھے صاحب لوگ کہا جاتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ حاضری مردے کے ماتم کے کھانے کو، بابا لوگ سادھو یا فقیر کو، مس بابا انگریزوں کے مؤنث بچوں کو، اور میم صاحب حکمران قوم کی عورت کو کہتے ہیں۔ جس طرح یہ الفاظ اور دوسرے بہت سے الفاظ انگلستان اور ہندوستان کے اختلاط کا نتیجہ ہیں، اسی طرح خدمت گار ملازم، نوکر، چاکر، ٹہلوا یا نفر کے بدلے لفظ بیرا استعمال ہوتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ جو کچھ، یہ سب مل کر کیا کرتے تھے' وہ تمام خدمات اکیلا بیرا انجام دیتا ہے۔ اگرچہ یہ ملازم بھی ہے اور پیش خدمت بھی، لیکن علی گڑھ والوں کی اصطلاح میں اسے آقائے نامدار کہتے ہیں۔ ان لفظی باریکیوں اور لغت کی الجھنوں کو چھوڑیئے۔ میری تحقیقات کے مطابق ہر بہرے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ بیرا ہو۔

لیکن ہر بیرے کے لئے بہرا ہونا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر بیرا اپنے مطلب کی فوراً سن لیتا ہے لیکن آپ کے کام کی بات حتی الامکان ذرا تکلف سے سنتا ہے۔ آپ فرمائیں گے اس کا ثبوت، تو بندہ نواز اس کا ثبوت مشاہدہ اور تجربہ ہے۔

سنی سنائی نہیں، اپنی آنکھوں دیکھی عرض کرتا ہوں میرے ایک دوست کے ہاں پانچ چھ ملازم ہیں حسب عادت ایک دن وہ سب بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور اپنے آقا کے تزکیۂ نفس کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، میرے دوست نے آواز دی کوئی ہے؟ ایک ملازم بولا چلی گولی، میرے دوست نے پھر آواز دی، دوسرا ملازم بولا آئی ایک گولی اور آئی، میرے دوست نے پھر کہا۔ بیرا۔ بیرا، خانساماں بولا تیرے لگی ابے اُٹھ، دو لگ چکی ہیں کہیں تیسری نہ لگے، اب سمجھے آپ؟ بیرے میں کس قدر بہرا پن ہوتا ہے۔

بیرے کی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اقسام ذاتی اور شخصی نہیں، بلکہ آقا کی اقسام کے مطابق ہوتی ہیں مثلاً بورڈنگ ہاؤس کا بیرا، کنوارے آدمی کا بیرا، گھر گرہستی کا بیرا، ہوٹل کا بیرا، ویٹنگ روم کا بیرا وغیرہ وغیرہ لباس اور جسمانی اعتبار سے بھی بیروں کی چند قسمیں ہیں۔ مثلاً فرنچ کٹ داڑھی والا بڑی سی سفید پگڑی

والا جس کی بندش کبھی چونچ دار ہوتی ہے کبھی گول، شرعی پاجامہ، ذرا اونچی سی اچکن، بیرا بہت لمبا ہوتا ہے نہ ٹھگنا، موٹا ہوتا ہے نہ دبلا۔ کالا ہوتا ہے نہ گورا۔ تندرست ہوتا ہے نہ بیمار، کارآمد ہوتا ہے نہ بیکار، جوان ہوتا ہے نہ بوڑھا، بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ یہ قسم روز پیدائش سے لے کر مرتے دم تک ایسی ہی رہتی ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جو پٹھے رکھتی ہے، کلاہ پر خاکی پگڑی باندھتی ہے، غرض کوٹ قمیص اور شلوار بھی خاکی ہوتی ہے، پاؤں میں چپلی اور کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی۔ تیسری قسم کا بیرا سفید کرمچ کا جوتا پہنتا ہے، اس کی پتلون بھی سفید ہوتی ہے، اس کا سر ننگا رہتا ہے لیکن اس کمی کو وہ دو جیبی گھڑیوں سے یا گھڑیوں کی چین لٹکا کر پورا کر لیتا ہے، اس کا آقا اس کو بیرا کہہ کر نہیں پکارتا، بلکہ بوائے کہہ کر بلاتا ہے۔

آپ نے آغا حشر کے ایک ڈرامہ میں شاید یہ گانا ضرور سنا ہوگا۔

بوائے بوائے! ایس سر ایس سر میز لگاؤ۔ وسکی لاؤ، بوائے بوائے ایس سر ایس سر!

یہ وہی بوائے ہے آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ یہ ایرانی مغبچہ ہے، یہ بچہ وچہ نہیں، اس کی عمر وہی ہے یعنی بوڑھا ہے نہ جوان۔ بلکہ بوائے ایک طرز خطاب ہے جو دنیا کے اور ملکوں میں بھی رائج ہے، عرب اپنے بوائے کو وَلَد کہہ کر پکارتے ہیں۔ افغان اور ایرانی او بچہ کہتے ہیں۔

امید ہے آپ کو بیرے کے مختلف ناموں اور اس کی تراش خراش کی پہچان ہو گئی ہو گی۔ اب ان کے عادات وفضائل اور دماغی خصائص کے متعلق بھی کچھ سن لیجئے۔

پرانے زمانے کے خدمت گار کی خصوصیات ہوتی تھیں۔ وفاداری، غم خواری، آقا کی عزت اور آبرو کی پاسداری، اس زمانے کے خدمت گار یعنی بیرے کی خصوصیت ہے، ہر وقت کی ظاہر داری اور حسب ضرورت کچھ وفاداری اور غم گساری، یہ وفاداری اور غم گساری والا بیرا اکثر بورڈنگ ہاؤس میں پایا جاتا ہے۔ اپنے خیال کے مطابق یہ ایک پردیسی طالب علم یعنی اپنے آقا کا خود ساختہ کم از کم چچا ضرور ہوتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے۔ ایک دن ہلکی ہلکی پھوہار پڑ رہی تھی، نوعمری کی ترنگ نے اس پھوہار سے لذت اندوز ہونے کی گدگداہٹ دل میں پیدا کر دی۔ اور میں اپنے کمرے سے نکل کر پاس کے بورڈنگ ہاؤس میں اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے چل دیا۔ اچھا خاصہ سو گز گیا ہوں گا کہ میرے کانوں میں اللہ دیے کی آوازیں آنے لگیں۔ صاحب یہاں آئیے۔ صاحب یہاں آئیے۔ یہ لیجئے۔ یہ آوازیں اس قدر بلبلاہٹ اور تحکمانہ انداز میں دی جا رہی تھیں کہ میں اپنے کمرے کی طرف لوٹ گیا۔ برآمدے میں میرا بیرا برساتی لئے کھڑا تھا، مجھے دیکھتے ہی بزرگانہ انداز میں بولا۔ سرکار بوندیں پڑ رہی ہیں، ٹھنڈ بھی ہے۔ نزلہ بخار ہو جائیے

تو مفت میں پریشانی ہو گی آپ یہ برساتی لیتے جائیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے برساتی اس کے ہاتھ سے لے لی اور روانہ ہو گیا۔

مجھے اللہ دیئے کی ایک بات یاد آگئی، اور مجھے یقین ہو گیا کہ میرا ہمدرد بیرا مجھ پر اپنی بزرگی کا سکہ جمانا چاہتا ہے۔ بس صاحب اس دن سے مجھے اپنے بچاؤ کی فکر لاحق ہو گئی۔ سات آٹھ دن تک میری اور اللہ دیئے کی دماغی جنگ ہوتی رہی آخر کار میں نے اس پر ایک کاری وار کیا۔ وہ مجھے کھانا کھلا رہا تھا۔ میں نے نہایت معصومانہ انداز سے پوچھا۔ بیرا! دنیا میں کتنی چیزیں ہونگی؟ "لاکھوں کروڑوں" اس نے کہا۔ اور اسی سانس میں دس بیس چیزوں کے نام بھی گنا دیئے۔ میں نے کہا نہیں بیرا۔ دنیا میں صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک چمچہ اور دوسری نہیں چمچہ

بیرے نے کہا اور یہ میز

میں نے کہا۔ نہیں چمچہ

اس نے کہا۔ آپ کا ریکیٹ

میں نے کہا۔ نہیں چمچہ

میرے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی، وہ مسکراہٹ جو حقیقی فتح کے بعد ایک فاتح کے چہرہ پر جلوہ نما ہوا کرتی ہے۔ وہ مسکراہٹ جو سکندر اعظم کے چہرے

پر راجہ پورس پر فتح پانے کے بعد رونما ہوئی تھی۔ اس دن سے میں آقا تھا اور میرا بیرا صرف بیرا۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ بیرا ہمیشہ بے قصور ہوتا ہے یعنی اگر کوئی چیز ضائع ہو جائے تو اس کی ذمہ داری بیرے پر عائد نہیں ہوتی۔ یہ ہمیشہ اس چیز کا قصور ہے کہ وہ ضائع ہو گئی۔ ایک دفعہ کوئی بیرا میرے ایک نہایت ہی کنجوس اور خسیس دوست کے ہاں ملازمت کرنے کے لئے آیا۔ اس کی عمر ۲۰-۲۵ برس کی ہو گی۔ میرے دوست نے پوچھا کیا کام جانتے ہو؟ کہاں کہاں ملازمت کی ہے؟ بیرے نے جواب دیا۔ حضور چٹھیاں دیکھ لیجیے۔ یہ کہہ کر تیس چالیس چٹھیوں کا پلندہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ میرے دوست نے متعجب ہو کر پوچھا کیوں بھئی تمہاری عمر کیا ہے؟ اس نے جواب دیا حضور یہی کوئی پچیس برس کی۔

میرے دوست نے دریافت کیا "اور نوکری کتنی مدت سے کر رہے ہو؟" بیرے نے جواب دیا "کوئی پانچ برس سے حضور"،

تو پانچ برس یعنی ساٹھ مہینے میں تم نے کوئی چالیس جگہ نوکری کی۔ بس ایسا آدمی مجھے نہیں چاہئے۔

بیرے نے کہا حضور میں خاندانی بیرا ہوں، اس پلندے میں دادا اور

والد صاحب کی چھٹیاں بھی شامل ہیں۔

میرے دوست اگرچہ بہت محتاط ہیں اور سخت ان کا نمایاں عیب ہے، لیکن وہ خاندانی قدامت اور عظمت کے بہت زیادہ قائل ہیں۔ انھوں نے اسے نوکر رکھ لیا، یہ سب واقعہ میرے سامنے پیش آیا۔ اس کے تین دن بعد میں ایک موٹر کی خرید کے متعلق اپنے دوست سے مشورہ کرنے ان کی کوٹھی پر گیا۔ مجھے پیاس لگی، میں نے پانی مانگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک جھنکار کی آواز آئی، جیسے شیشے کی کوئی چیز ٹوٹتی ہے میں نے کہا بیرے سے گلاس ٹوٹ گیا۔ میرے محتاط دوست بلبلا کر بولے "بیرا کیا گلاس ٹوٹ گیا؟"

بیرے نے جواب دیا، نہیں حضور۔ بجلی کے لیمپ کا گلوب اور بلب ٹوٹ گیا۔ میرے دوست نے پوچھا ارے وہ کیسے ٹوٹ گیا؟

بیرے نے کہا حضور خود بخود میز سے زمین پر آ پڑا، میں نے تو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ بس میز کے پاس سے گزرا تھا۔ اسی دن یہ بیرا تین دن کی ملازمت کے بعد اپنی چالیس چھٹیوں میں ایک اور کا اضافہ کر کے رخصت ہو گیا۔

خود میرے پاس ایک بیرا تھا، نہایت خدمت گزار اور وقت کا پابند۔ لیکن روپے دو روپے کے کام میں چار آنے پانچ آنے ضرور اڑا لیا کرتا تھا، میں غریب آدمی

اس کا روز کا خرچ دیتے دیتے تنگ آ گیا۔ میرے محتاط دوست کو حسبِ معمول ایک بیرے کی ضرورت تھی۔ وہ ہمیشہ میرے بیرے کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے اپنے اس بیرے کو ان کی خدمت میں بھیج دیا۔ میرے دوست بہت خوش ہوئے، انہوں نے اپنے نئے ملازم سے کہا، میں نے تمہاری بہت تعریف سنی ہے لیکن یہ بھی سنا ہے کہ تم روپے میں بارہ آنے مالک کو دیتے ہو، خیر ہمیں یہ بھی منظور ہے لیکن ایک شرط ہے یعنی اگر تم پہلے تین کاموں میں سے جو ہم تم کو بتائیں کچھ بنا لو تو پھر ہم کبھی حساب کی جانچ پڑتال نہیں کریں گے، اگر تم نہ بنا سکو تو پھر تم بھی توبہ کر لینا۔

بیرے نے جواب دیا۔ سرکار، شریف آدمی ہوں۔ دو چار حرف لکھ پڑھ بھی لیتا ہوں، اگر حضور کے حکم سے پھروں تو مجھ پر علم ہی کی مار پڑے۔

یہ جواب سن کر میرے دوست بہت خوش ہوئے، انہوں نے کہا۔ اچھا تو پھر پہلا کام یہ ہے کہ مُہرکن سے ہمارے نام کی مُہر بنوا لاؤ۔ نرخ طے ہو چکا ہے، وہ چار آنے فی حرف لے گا۔ مُہر پر محمد محسن کھودنا ہے، چار آنے فی حرف کے حساب سے دو روپے ہوتے ہیں، یہ لو دو روپے،

بیرا مہرکن کی دکان پر پہنچا، اس نے مہرکن سے کہا۔ لو میاں ایک مہر بنا دو۔

مہرکن نے دریافت کیا۔ کیا لکھنا ہے؟

بیرے نے جواب دیا "محمد بخش"

مہر کن نے متعجب ہو کر پوچھا "بھلے آدمی یہ کیا نام ہے"؟

بیرے نے کہا۔ میاں تمہیں اس سے کیا بحث ہے۔ میں گھنٹہ بھر میں لوٹتا ہوں، لیکن نقطے میرے سامنے لگانا۔ گھنٹہ بھر بعد بیرا دکان پر آیا۔ مہر تیار تھی، صرف نقطے لگانے باقی تھے، بیرے نے کہا۔ میاں مہر کن! ج اور ش کے پورے چھ نقطے ہوتے ہیں۔ میں پانچ نقطے معاف کرتا ہوں۔ رہا ایک نقطہ، وہ شین کے دائرے میں لگا دو، اور اپنے سات حرفوں کے دام چار آنہ فی حرف کے حساب سے یہ ایک روپیہ اور بارہ آنے لو۔

مہر لے کر بیرا اپنے آقا محمد بخش اور میرے دوست محمد محسن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے دوست نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ کہو بیرا۔ اس کام میں کچھ پلے پڑا یا نہیں۔ بیرے نے جواب دیا۔ حضور کے اقبال سے صرف چار آنے بچے ہیں۔ دریافت کرنے پر اس بچت کی ترکیب بھی بتادی۔

یہی بیرا کوئی چھ سال سے میرے دوست کے پاس ملازم ہے، اور وہ پہلے کی طرح اب اتنے محتاط نہیں رہے، آپ کہتے ہونگے آخر بیرے کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے، کوئی سیدھا سادا پرانی وضع کا روپے کے کام کے لئے ایک نوکر رکھ لو اور بس میں اس کے جواب میں ایک تاریخی واقعہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

محمد شاہ رنگیلے اور نادر شاہ ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، دہلی میں کشت وخون کے بعد صلح ہو چکی ہے، اس صلح کی خوشی میں رنگیلے پیا نے اپنے فاتح دوست کی دعوت کی ہے، جشن منایا جا رہا ہے۔ گانا ہو رہا ہے۔ ایک گانے والی کے فن کی داد نادر شاہ نے یہ کہہ کر دی،

"روے ہند سیاہ کن۔ بیا کہ ترا بہ ایراں ببریم"

"یعنی ہندوستان کا منہ کالا کر اور میرے ساتھ ایران چل" ہندوستانی رقاصہ نادر شاہی قتل عام کے ہنگامے بچشم خود دیکھ چکی تھی، ایران جانے کا خیال اپنے دل میں کیسے لاتی۔ لیکن انکار کی ہمت بھی نہ تھی، اس نے فوراً سازندوں کو اشارہ کیا۔ اور یہ شعر بڑے لطف اور درد سے گا کر سنائے :۔

من شمع جانگدازم تو صبح دلکشائی   سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی
نزدیکت این چنینم، دور آنچناں کہ گفتم   نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی

یعنی میں اپنی جان کو پگھلانے والی شمع ہوں اور تو دل کو کھلانے والی صبح، جب تو نظر نہیں آتا تو میں جلتی رہتی ہوں، لیکن جب تو نظر آتا ہے تو میں فنا ہو جاتی ہوں، تیرے نزدیک ہونے میں یہ حال ہے اور تیرے دور ہونے میں وہ حال، یعنی تیرے قریب ہونے کی ہمت ہے نہ تجھ سے جدا ہونے کی طاقت،

حضرت یہی حال ہمارا ہے، یعنی بیڑا ہو تو عذاب جاں ہے اور نہ ہو تو عذاب جسم،

شاعر

شاعر

تمام دنیا خدا کی مخلوق سے بھری پڑی ہے، چرند، پرند، انسان، حیوان، غرض اس میں کیا کیا کچھ نہیں۔ مرد ہے، عورت ہے، طوطا ہے، مینا ہے، بندر ہے، لنگور ہے، مگر مجھے اس کرۂ ارض کی تمام آبادی میں دو قسم کے جانداروں سے انتہائی ہمدردی اور محبت ہے، یعنی ایک شاعر اور دوسرا درزی۔

کہتے ہیں محبت کا دیوتا اندھا ہے، ممکن ہے یہ بات صحیح ہو، لیکن میری محبت کم از کم اس انتخاب میں اندھی نہیں۔ میں نے بڑی سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کے بعد اللہ کی اس مخلوق کو اپنی محبت کے لئے انتخاب کیا ہے۔

درزی بیچارہ ہر وقت آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہے، یہ درست سہی کہ وہ اپنی خدمت کی اجرت لیتا ہے، دنیا میں سبھی اپنے کام کی اجرت لیتے ہیں مگر درزی اجرت لیتا ہے برائے نام اور کام کرتا ہے لاجواب۔

غالب کا شعر ہے ؎

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

واقعی یہ کفن کا بہت بڑا احسان ہے۔ لیکن اتنا ہی نا کہ مردے کے عیب ڈھانک دیئے، اللہ تعالیٰ درزیوں کی نسل کو دن دونا اور رات چوگنا بڑھائے،.....

..... یہ لوگ نہ صرف جیتے جاگتے لوگوں کے عیب ڈھانکتے ہیں بلکہ اکثر ناکام اور کبھی کبھی کامیاب کوشش اس بات کی بھی کرتے ہیں کہ بھیانک سے بھیانک جسم، مثلاً بڑھی ہوئی توند، سانڈھ کی طرح اُبھرے کندھے وغیرہ وغیرہ خوبصورت نظر آنے لگیں۔ بدوضع سے بدوضع کپڑا لے جائیے، خواہ وہ چار گرہ کم ہی کیوں نہ ہو، بھونڈے سے بھونڈا جسم لے جائیے، مرد کو لے جائیے، بچے کو لے جائیے، اور درزی کو ہدایت کر دیجیے کہ کپڑا ایسا سی دے کہ بوڑھا جوان معلوم ہو، ٹھنگنا آدمی قدآور نظر آئے، کبڑا سروِ سہی کو شرمائے، مٹکا سی توند پر چیتے کی کمر کا شبہ ہو، ان پڑھ انسان عالم فاضل کی طرح ذی وقار جچے، غرضیکہ ایسی نظر بندی ہو جائے کہ جو نہیں ہے وہ دکھائی دینے لگے، بہرحال بیچارے درزی کا فرض ہے کہ کسی نہ کسی طرح گاہک کو خوش کرے۔

آپ نے شیریں فرہاد کا قصّہ ضرور پڑھا یا سنا ہوگا۔ وہ قصہ نہیں جو شاعروں نے گھڑ رکھا ہے بلکہ اصلی واقعہ، اگر سوءِ اتفاق سے آپ ابھی تک اس قصے سے محروم

ہیں نوش فرمائیے:۔

ایک تھے میاں فرہاد، انہوں نے شیریں کے حسن کی بہت تعریف سنی، اور اس پر غائبانہ عاشق ہو گئے، شیریں کا باپ مراقی تھا، اس نے کہا، میاں فرہاد شیریں کہتی ہے اگر تم میرے بنگلے تک ایک دودھ کی نہر کھود لاؤ تو میں خود تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤنگی۔ میاں فرہاد کے پلّے عقل تھی ضرورت سے زیادہ، آؤ دیکھا نہ تاؤ، نہر کھودنے میں جُٹ گئے، خدا جانے کتنے ہی سال، دن رات کھدائی کر کے نہر تیار کر ڈالی پچیس ہزار روپے کے دودھ کے ڈبے لائے، نہر میں پانی تو تھا ہی۔ اس میں ڈبوں کا دودھ گھول دیا۔ بس جناب یوں جوئے شیر قصرِ شیریں تک پہنچ گئی، نہر کو دیکھ کر شیریں خوشی سے پھولی نہ سمائی، فوراً اپنی انا کی انگلی پکڑ میاں فرہاد کے پاس آئی، میاں فرہاد اس نہر کی پُلیہ پر کھڑے دودھ کی روانی میں اپنی آئندہ زندگی کی تصویریں دیکھ رہے تھے اب جو فرہاد نے شیریں کی انّا کو دیکھا تو فوراً پوچھا، کہو بی انّا وہ تمہاری شیریں کہاں ہیں۔ انّا نے مسکرا کر جواب دیا۔ اور یہ میری انگلی پکڑے کون کھڑا ہے؟ یہ سُن کر فرہاد نے کنوتیاں کھڑی کیں۔ بڑے غور سے شیریں کو دیکھا، راوی کا بیان ہے کہ فرہاد نے بڑے زور سے لاحول ولاقوۃ کہا اور قلب کی حرکت یک لخت بند ہو جانے سے وہ جوئے شیر، کشاکشِ زندگی اور عشقِ شیریں یعنی تمام قیود سے رہائی پا گیا۔

یقین مانیئے اگر درزی فرہاد کی طرح کم حوصلہ ہوں تو ایک ہفتے کے اندر اندر قلب کی حرکت رک جانے سے مرجائیں۔ ان کا کام جوئے شیر لانے سے زیادہ کٹھن، اور ان کی اجرت حسنِ شیریں سے بھی کم ہے، لیکن اس زمانے میں دل قوی اور پیٹ بھو کے ہوگئے ہیں اس لئے بے چارہ درزی رشتۂ حیات تو قطع کرتا نہیں صرف کتر بیونت ہی کرتا رہتا ہے۔

ادھر شاعر بیچارے کا بھی یہی حال ہے، ممدوح کی مدح میں قصیدہ کہتا ہے، زمین سنگلاخ اور ممدوح ہمہ صفت موصوف یعنی ہشت پہلو، یہ گفتار کا غازی زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے، کسی نہ کسی طرح ممدوح کی خوشنودی کے لئے، سخن فہموں کی ضیافت طبع اور اپنے پیٹ کی دوزخ کے لئے لفظوں کی لڑیوں میں مضامینِ آبدار کے موتی پرو دیتا ہے، آپ سمجھتے ہونگے، اب قصیدے کا رواج اٹھ گیا ہے، لیکن نہیں، یہ خیال بالکل غلط ہے، صرف قصیدے کی صورت بدل گئی ہے، تنقید کی مشہور کتاب "روغن قاز" میں ادبیات کی اس صنف کا حال ملاحظہ فرمائیے، سردست آپ قصیدہ گو شاعر کو نظر انداز کردیں اور صوفی مشرب، تصوف کے گرویدہ شاعر کو لیں، آپ کو ایک اور ہی جلوہ نظر آئے گا۔ وہ اللہ سے راز و نیاز کی واردات میں اس بے تکلفی سے بیان کرتا ہے جیسے کوئی اپنے ہمسائے کا حال بیان کر رہا ہے، قلب کی صفائی، رُوح

کی پاکیزگی، اور عاقبت کی خبر تو خدا ہی جانے، مگر تصوف کی ترنگ میں ہر شاعر اللہ میاں سے عشق کرتا ہے، کبھی ہنستا ہے کبھی روتا ہے۔ اکثر بدلگامیاں اور گستاخیاں کر کے سننے والوں سے داد لیتا ہے، کسی نے کہا ہے مجاز حقیقت کا زینہ ہے۔ اس لئے شاعر کے لئے عشق مجازی بھی ضروری ہے، وہ چاروناچار ایک محبوب انتخاب کر لیتا ہے اور پھر اس کے عشق میں خونِ دل پی پی کر اور لختِ جگر کھا کھا کر زندگی کے دن پورے کرتا ہے، تمنا کی بیتابی، عشق کی صبر آزمائی۔ ہجر کی تکلیفیں، رقیب روسیاہ کا ڈر، غرض کیا کچھ ہے جو اس کی ننھی سی جان کو لگا نہیں رہتا۔ ان سب ہنگاموں کا اظہار وہ غزل میں کرتا ہے۔ مثل مشہور ہے رونا اور گانا دنیا میں ہر شخص کو آتا ہے، بے چارہ شاعر بھی ایک قسم کا انسان ہے اس لئے روتا بھی ہے اور گاتا بھی ہے البتہ روتا ہر وقت ہے اور گاتا صرف مشاعرے میں ہے، جی تو چاہتا ہے کہ شاعروں کے رونے اور گانے کے کچھ نمونے بھی پیش کروں لیکن ؎

مزا جب تھا کہ خود سنتے وہ مجھ سے داستاں میری

کیا کبھی کسی شاعر کے محبوب کو آپ نے دیکھا ہے؟ نہیں، اچھا تو پھر اس کی تعریف میں اشعار سنے ہیں؟ نہیں، خیر اس کے خدوخال کی ایک جھلک میں دکھائے دیتا ہوں۔

زلفِ عنبریں طولِ شبِ فراق سے بھی دو ہاتھ بڑی، یعنی اگر ہجر کی رات جاڑے کی رات ہے تو کوئی سولہ گھنٹے کی۔ چہرہ ایسا جیسے چاند اور سورج، منہ میں دانتوں کے بدلے موتی، گردن صراحی دار، قامت قیامت، چال جیسے کڑی کمان کا تیر، آنکھ بدمست شرابی، نگاہ محشر خیز، چتون شرارت سے لبریز، ابرو تلوار سے تیز، اور لب خون سے رنگے ہوئے۔

اب آپ اپنے ذہن میں اس حسین صورت کا نقشہ آسانی سے کھینچ سکتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے حضرت یہ تشبیہ اور استعارے ہیں۔ ان سے تمام حقیقت روشن ہو جاتی ہے اور شاعر کو اختیار ہے کہ جن الفاظ میں چاہے اپنے دلدار کی تصویر کھینچے، مثلاً اگر میں اپنے محبوب کے چہرے اور آنکھوں کی تعریف کرنا چاہوں تو بلا تکلف کہہ سکتا ہوں:۔

ترا روئے روشن ہے بجلی کا ہنڈا
تری چشم وا ایکسرے کا مکاں ہے

مجھے ڈر ہے کہ کہیں کوئی من چلا شاعر اپنے عشق یا شاعری کی ترنگ میں اپنے محبوب کو یہ نہ کہہ بیٹھے لیکن شاعر ہوتا ہے ہوشیار، وہ حاضر سے ڈرتا اور غائب سے اکڑتا ہے۔ اس کے محبوب کو چھوڑیئے۔ وہ تو میرے اور آپ کے اوپر بھی "روغن قاز" کا

استعمال کرنے سے نہیں چوکتا۔ بلکہ یوں بھی کہہ دیتا ہے ؎

کچھ روز اور دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

چھوڑیئے ان سب قصوں کو، آئیے آپ کا شاعروں سے تعارف کرائیں لیکن خیال رہے ذرا ناک بھوں نہ چڑھائیے گا، شاعر ہوتے ہیں تلامیذ الرحمٰن، ان کو آپ کے نام نہاد علم و فضل کی ضرورت نہیں، ہاں اس بات کی بے شک ضرورت ہے کہ ان کے پاس ایک تان لگانے والا خوش گلو چھوکرا ضرور ملازم ہو۔ جہاں ذرا سکتے کا شبہ ہوا، اور شاعر صاحب نے آواز دی "او بے رحیما ذرا گائیے کے سنا" اور یہ سنتے ہی رحیما نے ایک زور کی تان لگائی، ؎

پھوٹتی ہیں کونپلاں اور پھدکتی ہیں بلبلاں

لو صاحب مشاعرے کے لئے مصرعہ تیار ہے، دیکھنا، وہ شعرائے کرام چلے آرہے ہیں، ان میں گل و بلبل کی داستان سنانے والے بھی ہیں اور سرمایہ دار اور مزدور کے نوحہ خوان بھی، مجدد فن بھی ہیں اور مخلِ فن بھی، لیجے آہی پہنچے، ایک صاحب آگئے آگئے ہیں، سر پر دو پلڑی ٹوپی، داڑھی چڑھی ہوئی، جامہ وار کا انگرکھا، ڈوبرکا کلیوں دار پاجامہ، آنکھوں میں سرمہ، دانتوں پہ مسّی، کندھے پر رومال، ہاتھ میں عصا،

اے حضرت آپ کہاں سے تشریف لائے، ؎

ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

قبلہ کچھ اپنی کہئے نا ؏

زباں دانی کے ہم داماد ہیں اور دلی والے ہیں

درست ہے پہچان لیا جناب کو، گلی قاسم جان کے آس پاس چو ہیا ہیم کے چھتے ہی میں تو آپ کا دولت خانہ ہے نا۔ اچھا حضرت اپنا کلام بلاغت نظام سنائیے، واللہ کرم ہوگا کرم،

ارشاد ہوتا ہے:۔

سنا ہے کہ ان کے کمر ہی نہیں ہے　　خدا جانے خنجر کدھر باندھتے ہیں

رقیبوں کو ہے ان کے جلوے کی خواہش　　مداری ہیں گویا نظر باندھتے ہیں

وہ نازک ہیں لیکن ہیں عیّار پورے　　رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتے ہیں

سبحان اللہ سبحان اللہ۔ اے حضرت کیا نازک خیالی ہے واللہ،

صاحب یہ انھوں نے بڑا کرم کیا کہ اپنا کلامِ معجز نظام سنا دیا، بے حد تنک مزاج ہیں، ایسے ویسے سے کبھی بات بھی نہیں کرتے کہ زبان ہی خراب ہو جائے گی اور کوثر میں کرِک پڑ جائے گی، خیر ؏

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

یہ دوسرے بزرگ کون ہیں حضرت یہ بھی شاعر ہیں۔ علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ، وہیں کی قطع کی شیروانی سرسید کے کالج کے لڑکوں کی سی ٹوپی، پاؤں میں سیاہ پمپ شوز، ارے میاں یہ شاعر واعر نہیں، کوئی کالج کے طالب علم ہیں۔ نہ صاحب انہیں میں پہچانتا ہوں۔ شاعر ہیں اور خرانٹ، جی چاہے تو ان کا سر ٹٹول کر دیکھ لیجے، یہ صاحب سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ طرز جدید کے مایۂ ناز شاعر ہیں اردو شاعری میں نئی نئی یورپین وضع کی اصناف سخن ایجاد فرماتی ہیں تشبیہات کی چھل بل بیان کی طمطراق اور ان کے تخئیل کی اچھل کود ملاحظہ فرمائیے:۔

میرا عشق ہے ایک سمندر تیرا حسن ہے پورا بندر
اس جا کودا اس جا اچھلا آجا آجا میری جباں
کرپا کر تو میری جان

دل کو میرے لے کر بھاگا ہٹ تیرے کی دم میں دھاگا
عشق میں تیرے راتوں جاگا کرپا کر تو عشق کے راجا
کرپا کر تو میری جان

کھولے پٹ ہے ایک پجاری سامنے تیرے پریت کا مندر
جوت سے اپنی کر دے اُجالا آجا آجا دل کے اندر

اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ اور گلے میں باہیں ڈالے کون صاحب چلے آتے ہیں وضع قطع آدھا تیتر آدھی بٹیر۔ البتہ شکل بڑی کٹکھنی بنا رکھی ہے، اور بڑے بڑے جھاڑ سے بال اٹھے اور منہ پر پڑے ہیں۔

یہ مجنوں ہے نہیں آہوئے لیلیٰ — پہن کر پوستیں نکلا ہے گھر سے
جنہیں تو سینگ سمجھے ہے یہ ہیں خار — چبھے تھے پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

میاں جیب بھی ہو جاؤ۔ یہ بھی شاعر ہیں۔ انہوں نے سرمایہ داروں کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ اور مزدور کو تختِ کسریٰ بخش دیا ہے، لو کیا یاد کروگے ان کے اشعار بھی سُن لو:۔

وہ پیسے والے بھوت سب چلے ہیں پر عمال کو — اٹھا لے اپنا پھاوڑا سنبھال لے کدال تو
تو لاٹھیوں کو سہہ بھی لے تو جوتیاں بھی کھائے جا — زمانے بھر کے حادثوں کو مسکرا کے ٹال تو
جفا کشی کی بجلیوں سے ظلمتوں کو دور کر — جہاں میں تجھ سے روشنی جہاں کا ہے جمال تو
اٹھا لے اپنا پھاوڑا سنبھال لے کدال تو

ماشاء اللہ پر عمال کا استعمال قابل غور ہے، اچھا بھئی یہ سب تو شاعر ہوئے یہ ان کے پیچھے پیچھے کون صاحب چلے آتے ہیں۔ کوٹ پتلون ڈانٹے، ڈاڑھی مونچھ منڈائے اور چپ ٹ منہ میں دبائے یہ تو کسی انگریزی اخبار کے رپورٹر معلوم ہوتے ہیں۔

آپ بھی عجب چیز ہیں۔ یہ بھی شاعر ہیں اور بڑے شاعر ہیں یعنی جو کچھ پہلے

شاعروں کو میسر تھا انہیں اس کی بالکل خواہش نہیں۔ اور جس کی پہلے شاعروں کو تمنا تھی وہ انہیں بھلی بری بھلی کم اور بری زیادہ مل ہی جاتی ہے، یعنی

وے باشد وُے باشد وُے باشد و وے

یہ اللہ کی نرالی مخلوق ہے، اس کی سرشت اور مزاج سدا سے ایک جیسا چلا آرہا ہے، یہ صرف بھیس بدلتے رہتے ہیں۔ مگر ان کی چال ڈھال اور سج دھج پہچاننے والے انہیں ہر لباس میں پہچان لیتے ہیں ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش
من انداز قدت را می شناسم

لکھنؤ ہو یا دلی، پنجاب ہو یا حیدرآباد دکن، یہ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والی مخلوق ہر جگہ موجود ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے ادبی جلسے اب خواب و خیال ہو گئے لیکن ماشاءاللہ ستلج اور چناب کے درمیان کی مخلوق ابھی نغمہ ریز ہے، ؎

خدا پنجاب را مسرور دارد ز شعر شاعراں معمور دارد

حضرت ان کی وضع قطع اور لباس و کلام سے قطع نظر کیجیے۔ یہ سب بھلے مانس اور نیک لوگ ہیں۔ ان میں سے اکثر بیچارے بہت ہی بھلے آدمی تھے لیکن خدا کی قدرت شعر کہنا شروع کر دیا ؏

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا درزی کی بات تھی یا شاعر کی، کچھ انہیں کے متعلق تھا خوب یاد آیا۔ ایک شاعر نے درزی سے کہا کہ جناب شعر کہہ دیجئے اور اس نے اچکن سی دی۔ جی نہیں میں پھر بھولا۔ کسی درزی نے ایک شاعر سے کہا میاں میرے لئے ایک اچکن سی دو اور اس نے شعر کہہ دیا،

منشی جی

منشی جی

فرنگی اقوام اپنے معمولی پیشہ وروں کی بھی اس درجہ قدر و منزلت کرتی ہیں کہ ادنےٰ سے ادنےٰ پیشوں کا رتبہ بڑھتے بڑھتے اچھے اچھے معتدبہ پیشوں کے برابر ہو جاتا ہے، تاجروں اور اہل حرفہ کا تو کہنا ہی کیا۔ مسخروں کو لیجئے۔ بھلا ہمارے ملک میں ان بیچاروں کی کیا حیثیت ہے؟ بمشکل تمام یہ لوگ نُقلِ محفل ہوتے ہیں۔ اگلے دنوں میں بیاہ براتوں کے موقعوں پر لوگوں کو ہنسا ہنسا کر اپنی روزی کما لیتے تھے۔ اب اسٹیج پر ٹھرک ٹھرک کر معاش فراہم کر لیتے ہیں۔ میں نے سنا ہے، یورپ میں یہ بات نہیں۔ وہاں رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور ہیں۔ بات یہ ہے فرنگی اپنے ہر برے بھلے کی قدر کرنی جانتے ہیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ سالانہ خطاب کی فہرست میں ایک وزیر کابینہ اور کسی مشہور مسخرے کو ایک ہی خطاب سے سرفراز کیا گیا ہو ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

خیر ان اگلے گلوں شکووں اور بے سروپا قصوں سے کیا حاصل؟ مطلب کی بات سنئے۔ میں ایک منشی پڑھا لکھا ہوں اور میرے اکثر دوست احباب بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان میں سے کئی ایک سرزمینِ افرنگ کی زیارت سے بھی مشرّف ہو چکے ہیں۔ ایک دن ایک ایسے ہی صاحب فرما رہے تھے کہ ایک دن وہ لندن میں تھئیٹر دیکھ رہے تھے، اس تماشے میں ایک مسخرہ بھی کام کر رہا تھا۔ اس کی خوش گوئی اور بذلہ سنجی سے سبھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ تماشائیوں کے سامنے اپنے معاشقے کا رونا رو رہا تھا۔ کبھی ہنستا تھا، کبھی روتا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے کہا۔ صاحبو! اس وقت میری عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ گویا نہ تو میں اس قدر سالخوردہ ہوں کہ صنفِ نازک سے رسم کی آرزو نہ رکھوں اور نہ اس درجہ جوان کہ یہ لوگ مجھے اپنی پُرکیف صحبتوں میں شوق سے شریک کریں۔ غور فرمائیے۔ یہ مسخرہ مذاق مذاق میں کیسے کام کی بات کہہ گیا۔ واقعی وہ بڑھاپا جس میں جوانی کا واہمہ باقی رہے۔ اور وہ جوانی جس میں بڑھاپے کی اکثر معذوریاں موجود ہوں، یقیناً بہت تکلیف دہ ہے اگر یہ وقفہ ساری عمر میں صرف پانچ چھ سال کے لئے باعث اذیت ہوتا ہے۔ یعنی چالیس سے پچاس برس تک، نہ ادھر نہ ادھر۔ ان لوگوں کا کیا حال ہوتا ہو گا جنہیں کوئی جماعت قبول نہیں کرتی۔ اور بذاتِ خود وہ اتنے اہم نہیں ہوتے کہ اوروں سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کریں۔ مثالاً قصبے کے رہنے والوں کو لیجئے

نہ وہ شہری نہ دیہاتی۔ شہر والے انہیں بد سلیقہ سمجھتے ہیں اور گاؤں والے انہیں بر خود غلط کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ذرا ہماری قوم یعنی منشی صاحبان کا حال ملاحظہ فرمائیے، ہم لوگوں کا مبلغِ علم اتنا نہیں ہوتا کہ جہلِ مرکب سے باز رہیں۔ لیکن پڑھے لکھے ہونے کی حیثیت سے ہر وقت خدشۂ علم میں مبتلا رہتے ہیں۔ بس یوں سمجھئے کچہری اور دفتر کے لئے ہمارا علم کافی نہیں اور نوکری ڈھونے کے لئے ہم لوگ کافی جاہل نہیں۔ گویا بچارے منشی جی بھی خزاں کی تیز و تند ہواؤں میں بھٹکتے پھرنے والے پتّے ہیں جو راندۂ شاخ و شجر اور بارِ صحنِ چمن ہو جاتے ہیں۔ کاش قدرت نے اس ملک میں منشی بنانے کے بدلے کسی فرنگی ملک میں مسخرہ بنایا ہوتا!

شاید آپ نے میری اس گذارش کو تعلّی سمجھا۔ نا صاحب ظلم نہ کیجیے، بے دیکھے بھالے اور بے ملے جلے کوئی رائے قائم نہ کیجیے۔ اچھا اب آپ یہ بتلائیے کیا آپ کی کسی منشی سے ملاقات ہے؟ غالباً ضرور ہوگی۔ اگر نہیں تو میں بھی ایک منشی ہوں، اور میری ملاقات آپ سے ہو چکی ہے، آخر دیگ میں سے ایک ہی چاول تو دیکھا جاتا ہے۔ ہاں تو آپ نے کبھی منشی جی کی تحلیلِ نفسی بھی کی ہے؟ یعنی انہیں سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر آپ نے اب تک یہ سعادت حاصل نہیں کی تو لیجئے میں خود ہی عرض کئے دیتا ہوں،

دیکھیے منشی جی کی قسم ہر جگہ بالکل ایک ہی سی ہوتی ہے۔ یعنی جنگلی کا منشی کچہری کا منشی، مدرسے کا منشی، دولت مند منشی، قلاش منشی، سچ مچ کا منشی اور جھوٹ موٹ کا منشی، غرض ادھر کا منشی ادھر کا منشی یہاں تک کہ عالم بالا کا منشی، ان سب میں بال برابر بھی فرق نہیں، اہلِ نظر اور صاحب دل منشی جی کو ہر رنگ اور ہر روپ میں پہچان لیتے ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے جنگلوں سے گینڈا اور شہروں سے منشی کم و بیش مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ گینڈے کے ناپید ہونے سے ہندوستان کو جو بھی نقصان پہنچا ہے اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن منشی جی کے کمیاب ہونے سے بیک وقت سنجیدگی، تفنن۔ علم اور جہل مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔

کسی عاشق سے پوچھیے، عشق میں کیا لذت ہے؛ کسی زاہد سے دریافت کیجیے، عبادت میں کیا لطف ہے؛ اسی طرح اہلِ دل اور صاحبِ مذاق لوگوں سے دریافت کیجیے کہ منشی جی کے عدمِ وجود سے کیا کیا خیر و برکت کم ہو گئی۔ حق یہ ہے کہ جنگِ عظیم کے بعد کی نسل منشی جی کی حقیقت سے قطعی ناواقف ہے، لیکن جن لوگوں نے جنگِ عظیم بھی دیکھی ہے اور موجودہ جنگ بھی دیکھ رہے ہیں۔ وہ یقیناً منشی جی کی اہمیت سے پوری طرح واقف ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے ایک صاحب فرما رہے تھے کہ منشی جی کی اہمیت پہلی جنگ سے زیادہ تھی، اور اس جنگ سے کچھ کم نہیں۔ بہرحال آج

کس مپرسی کا عالم ہے بمیاں ؎

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے

بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

منکہ ایک منشی ہوں، میری حیثیت معلوم، آپ نے یہ تو سنا ہی ہوگا لوہے کو لوہا کاٹتا ہے اور مچھلی کو مچھلی کھا جاتی ہے بالکل اسی طرح منشی کو منشی کھاتا ہے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا اسے قیاسی نہ سمجھئے یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے:۔

میرے بچپن کا قصہ ہے میں قرآن پاک ختم کر چکا تھا، لیکن ہر روز ایک منشی جی صبح کے وقت آیا کرتے تھے، اور میں ان کو ایک پارہ قراءت سے سنایا کرتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد دوسرے منشی جی آتے، ان سے میں اردو اور فارسی پڑھتا تھا، ان دونوں بزرگوں میں کچھ یونہی سی لاگ ڈانٹ تھی، اسے علمی چشمک تو نہیں کہہ سکتے البتہ غضبِ شکمی کہا جائے تو نامناسب نہیں۔ یہ غضبِ شکمی ایسا مرض ہے جس کا ذکر طب یا ڈاکٹری کی کتابوں میں کہیں نہیں ملتا۔ البتہ میرے مشاہدے میں ضرور آچکا ہے۔

کبھی قرآن پاک پڑھنے سے پہلے میں ناشتہ کرتا اور کبھی پڑھنے کے بعد جس روز قرآن پاک سنانے سے پہلے ناشتہ کرتا اس روز قرآن سننے والے منشی جی کی خدمت میں ناشتے کا ایک خوان آجاتا، اور اگر میں قرآن خوانی کے بعد ناشتہ کرتا تو

فارسی پڑھانے والے منشی جی کو وہی خوان مل جاتا یعنی اگر قاری صاحب کو ملتا تو منشی جی محروم رہتے۔ اور اگر منشی جی کو ملتا تو قاری صاحب منہ دیکھتے رہ جاتے، بہر دو صورت اس کا خمیازہ مجھی کو بھگتنا پڑتا۔ اگر میں قاری صاحب کے ساتھ ناشتہ نہ کرتا اور قرآن پاک سنانا شروع کر دیتا تو اس دن ہر سطر پر میری غلطی پکڑی جاتی کبھی مد کو پوری طرح کھینچ کر نہ پڑھنے کی سزا میں مجھ پر قمچی کھنچتی اور کبھی زیادہ کھینچ کر پڑھنے کی پاداش میں چپت پڑتی۔ کبھی ہمزہ کی تجوید نہ کرنے پر مجھے ہچکی آنے لگتی اور کبھی ث اور ص کا فرق واضح نہ کرنے پر بھی ہی کرنی پڑتی۔ بہرحال قرأت کا وقت سخت مصیبت سے گزرتا۔ ہاں اس روز فارسی والے منشی جی کے دو تین گھنٹے ہنسی خوشی سے گزر جاتے! اگر سوءِ اتفاق سے کسی روز قاری صاحب ناشتہ اڑا جاتے تو منشی جی تمام وقت سر کپڑے بیٹھے رہتے اس دن مجھے اقلیدس کے اصولِ موضوعہ اور علومِ متعارفہ کے فروع سب بھول جاتے منطق کے ارکان بھی یاد نہ رہتے۔ بس میری گدی ہوتی اور ایک منشیانہ ہاتھ کی عمودی بارش، یا میرے ہاتھ صغریٰ بن جاتے اور منشی جی کی قمچی کبریٰ۔ اور اس کی علی التواتر جنبش کلیہ۔ گویا قاری صاحب اور منشی جی کے ہاتھوں میری شامت روزانہ آئی رہتی۔ پھر بھی میں خدا لگتی کہوں گا۔ ہمارے اصلی منشی جی جو اُردو اور فارسی پڑھاتے تھے۔ نہ قاری صاحب کی طرح پیٹو تھے اور نہ ان کی طرح سنگ دل۔ میں اب تک سوچا کرتا ہوں کہ قاری صاحب

زبردستی منشی جی بن بیٹھے تھے، ورنہ حقیقتاً وہ مسجد کے ملا تھے، اور سچ یہ ہے کہ

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

پھر بھی جو کچھ میں نے حاصل کیا یہ انہی کے طفیل ہے لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا

"ہر چہ خواہی باش مگر منشی مباش"

اپنے اصلی منشی جی کی ایک خصوصیت کا میں آج تک معترف ہوں۔ اگر پڑھاتے ہوئے ان سے کبھی کوئی غلطی ہو جاتی تو پھر یہ ناممکن تھا کہ اس کی تصحیح ہو سکے۔ چاہے منشی جی اپنے دل میں قائل ہی کیوں نہ ہو جائیں آپ ہی فرمائیے ایسے وضعدار منشی آج کل کہاں ملتے ہیں۔ ویسے کہلانے کو سیکڑوں ہیں ہزاروں ہیں، مگر وہ بات کہاں؟

ایک روز وہ ذوقؔ کا ایک قصیدہ پڑھا رہے تھے کسی مصرعہ میں تھا "کہ بخ بخ بوئے یار آمد"۔ منشی جی اپنی لہر میں "بخ بخ نوئے یار آمد"۔ پڑھ گئے۔ اس دن کے بعد سے منشی جی ہمیشہ "نوئے یار آمد" ہی پڑھتے اور پڑھاتے رہے۔ اسی طرح اردو کی کتاب میں انگلستان کے شہزادے کا مرثیہ پڑھاتے ہوئے ارشاد ہوا ؎

جھک گیا اے فورٹ ولیم آج کیوں جھنڈا ترا

ہے اُداسی تجھ پہ کیوں چھائی ہوئی اے اَنڈیا

میں نے فوراً عرض کیا۔ منشی جی اَنڈیا نہیں اِنڈیا ہے۔ بولے خاموش بے ادب گستاخ۔

احمق کہیں کا۔ اب استادوں کی زبان پکڑتا ہے۔ ہو گا انگریزی میں انڈیا۔ ہماری زبان میں اَنڈیا ہی بولا اور لکھا جاتا ہے۔ جناب اس دن سے انڈیا ہمیشہ کے لئے اَنڈیا ہو گیا۔

اب آپ ہی فرمائیے موجودہ دَور کے منشیوں میں یہ باتیں کہاں ہیں ؟

اسی سلسلے میں مجھے منشی خالق باری بھی یاد آگئے، اللہ بخشے کیسے باغ وبہار آدمی تھے۔ اب ویسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ کہنے کو تو میں بھی منشی ہوں لیکن سے

ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

منشی خالق باری کیا مرے نُورپور کی رونق ہی ختم ہو گئی۔ ویسے تو نورپور ایک معمولی سا قصبہ ہے مگر خدا اس سرزمین کو معمور رکھے۔ اس مردم خیز قصبے میں دو تین ڈپٹی کمشنر، تین چار جج اور بیرسٹر، وکیل تو آٹھ نو ہوئے، کچہری کے افسروں اور اہل کاروں کو چھوڑیئے، حضرت امام الامت نے بھی اپنا سلسلہ رشد وہدایت یہیں سے شروع کیا تھا، مسلم لیگ کے صدر اور کانگرس کے پردھان بھی اسی جگہ سے منتخب ہوئے، لیکن ان سب پر بھاری، خدا بخشے ہمارے منشی خالق باری تھے،

یہ درست ہے وہ سرکاری افسر تھے نہ دینی پیشوا، قومی لیڈر تھے نہ سیاسی گرگٹ، لیکن نورپور میں ان کے دم سے اجالا تھا۔ بچے بوڑھے جوان غرض سبھی کے دل میں منشی

خالق باری کی عزت تھی، اگرچہ وہ نہائے دھوئے منشی تھے، مگر آخر دم تک کسی کو یہ پتہ نہ لگ سکا کہ منشی جی کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ کبھی کسی کا خط یا منی آرڈر لکھ دیا کبھی کسی دوست کے لئے عمارتی سامان خرید لائے، اگر آپ نے یا کسی اور نے دس پانچ کی چیز منشی جی کی خدمت میں پیش کر دی تو اسے ذریعہ معاش کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ بہر حال وہ عجب خیر و برکت والے انسان تھے، مرتے دم تک ان کی خوش خرمی اور سفید پوشی اللہ نے قائم رکھی۔

آپ جانتے ہیں، مَیں بھی ایک منشی ہوں، اس لئے منشی خالق باری اکثر میرے غریب خانے پر بلا تکلف قدم رنجہ فرمایا کرتے تھے۔ ہمیشہ تیسرے پہر آتے چائے کی ایک پیالی نوش فرماتے، پان کی گلوری شوق کرتے، پھر حقہ لے کر بیٹھ جاتے، کش پر کش لگاتے اور اہلِ کمال کی آشفتہ حالی کا رونا بڑے درد سے روتے، ہر روز ان کی گفتگو کا موضوع کم و بیش یہی ہوا کرتا تھا۔ لیکن جناب کیا مجال جو ان کی باتوں سے کبھی دل اکتایا ہو، کہتے ہیں باسی چیز بد مزہ ہو جاتی ہے، لیکن منشی خالق باری کی باتیں ہمیشہ گرما گرم اور چٹ پٹی رہیں۔ آپ سوچتے ہونگے۔ بھلا منشی خالق باری اہل کمال کی آشفتگی کا رونا روز کیوں روتے تھے! وہ اس لئے کہ منشی جی ماشاء اللہ خود صاحبِ کمال تھے، اور بد قسمتی یا خوش قسمتی سے آشفتہ حال بھی۔

ایک دن کوئی منشی جی کہیں باہر سے آتے ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھا۔ یہاں منشی خالق باری کی بڑی تعظیم و تکریم ہوتی ہے۔ شاید رشک یا حسد کی آگ ان کے دل میں بھڑک اٹھی، لگے منشی جی کی گہرائیوں کا جائزہ لینے۔ بھلا منشی خالق باری کوئی کچی گولیاں کھیلے تھے، وہ ڈال ڈال تو یہ پات پات۔ منشی خالق باری نے پروں پر پانی تک نہ پڑنے دیا۔ اور وہ حضرت بغلیں جھانکتے رہ گئے۔ اگر آج کل کا کوئی ہمسوال منشی ہوتا تو قلعی کھل کر رہ جاتی۔ مانا کہ منشی خالق باری کو علوم حاضرہ سے کوئی لگاؤ نہ تھا لیکن ہمارے مہمان منشی جی ان کے رسمی علوم کی گہرائی کا بھی پتہ نہ لگا سکے۔

منشی خالق باری کا خط منشیانہ تھا یعنی اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اچھا تھا یا برا۔ شکستہ تھا یا نستعلیق، البتہ ایک بات قابل غور تھی یعنی منشی جی کی جدت پسند طبیعت املا کے معاملے میں اصولِ ہجا سے بالکل بے نیاز واقع ہوئی تھی۔

دورانِ گفتگو میں کبھی کبھی منشی خالق باری اپنے کمالات فنی اور تحصیلات علمی پر بھی روشنی ڈال دیا کرتے تھے، جب کبھی کوئی ان کے سامنے دو چار بڑی بڑی کتابوں کے نام لیتا اور کہتا کیوں منشی جی یہ کتاب تو آپ کی نظر سے ضرور گزری ہو گی؟ منشی جی چترا جاتے اور کہتے "حضت"! اب کیا کہیں اور کس سے کہیں۔ ہم نے کیا پڑھا اور کیا دیکھا۔ البتہ یہ ضرور جانتے ہیں۔ جو کچھ ہمارے نصیب میں تھا۔ وہ آج کل کے زمانے

میں کسی کو میسر نہیں۔ ہم نے "خالق باری" حضرت خواجہ امیر خسرو علیہ الرحمہ کے قلمی نسخے سے پڑھی تھی۔ خدا کی قسم کیا کیا پر مغز حاشیے چڑھائے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے۔ حاشیے کے مقابلے میں متن بالکل پھیکا پڑ گیا ہے۔ یہ سن کر یاروں کے کان کھڑے ہوئے اور کہا، "خالق باری" کے حاشیے اور پھیکا متن! یعنی چہ؛ امیر خسرو کی قلمی خالق باری ضرور عجوبۂ روزگار ہوگی۔ میں نے عرض کیا، منشی جی مجھے وہ خالق باری کا نسخہ ضرور دکھایئے گا۔ فرمایا۔ ہاں ہاں۔ کیوں نہیں اب جو آؤنگا تو ضرور لیتا آؤنگا۔ یہ کہہ کر منشی جی نے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ کوئی دس منٹ بعد منشی جی جانے لگے تو میں نے یاددہانی کرائی اور عرض کیا جناب! وہ خالق باری بھول نہ جائیے گا نہیں۔ منشی جی نے فرمایا، نہیں صاحب ہرگز نہیں۔ یہ کہہ کر منشی جی کسی اور سے باتوں میں الجھ گئے، خدا گواہ ہے شرارت مقصود نہ تھی، بلکہ صرف اس نادرۂ روزگار خالق باری کا نسخہ دیکھنے کا شوق تھا، پھر یاددہانی کر دی، منشی جی ذرا تنک کر بولے اجی بس بس لیا۔ لے آؤنگا۔ خالق باری!

منشی جی رخصت ہوئے، میں نے پھاٹک تک جا کر "خالق باری" کی یاددہانی پھر کر دی۔ اب کی مرتبہ منشی جی بڑے برہم ہوئے، چیخ کر بولے۔ میاں کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ منشی جی کا غصّہ دیکھ کر مجھے فوراً شرارت کی سوجھی، ایک آدمی ان کے پیچھے لپکایا۔ وہ چلّاتا ہوا دوڑا منشی جی! منشی جی! منشی جی رک گئے، اور کہا بھائی کیا ہے؛ اس نے

گھا رہیاں کہہ رہے ہیں۔ "خالق باری" کو بھولئے گا نہیں۔ یاد رکھئے گا۔ بس صاحب منشی جی کو غصہ آ گیا۔ پھر آئیں جائیں کہاں۔ لکڑی اٹھالی اور پھاڑ کھانے کو دوڑے۔ منشی جی کا بھڑکنا اور محلے کے لڑکوں کی بن آنا۔ ادھر ادھر سے "منشی جی خالق باری" "منشی جی خالق باری" کی آوازیں آنے لگیں۔ اب منشی جی ادھر لپکتے ہیں۔ ادھر بھاگتے ہیں۔ لیکن لڑکے بھلا کب ہاتھ آتے ہیں۔ وہ تو خیر ہوئی ان کا گھر قریب تھا۔ اول فول بکتے جھک جھک کرتے اپنے گھر میں گھس گئے۔ گویا قلعہ بند ہو بیٹھے۔ اس دن سے منشی جی کا نام خالق باری پڑ گیا۔ منشی جی بھی جہاندیدہ انسان تھے۔ سمجھ گئے۔ اپنے آپ کو سنبھالا۔ غصہ تھوک ڈالا۔ اور اسی نام سے خوش ہونے لگے ،

رونا

رونا

کہتے ہیں ایک صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی۔ وہ چاہتے یہ تھے کہ اپنی بیوی پر شروع ہی سے رعب جما لیں۔ نئی نویلی دلہن بڑے چاؤ چونچلوں سے سسرال آئیں جگمگاتی مسند پر گھونگٹ نکالے سر جھکائے بنی سنوری بیٹھی تھیں۔ جب موقع ملتا۔ کن انکھیوں سے ادھر ادھر دیکھ لیتیں۔ البتہ ان کے کان سب باتیں بے لاگ سن رہے تھے وہ سہیلیاں جو ساتھ لگی بیٹھی تھیں۔ برابر بتائے جا رہی تھیں کہ دیکھو یہ تمہارے دیور کی آواز ہے اور وہ تمہارے خلیا سسرے چلے آتے ہیں۔ دلھن بیگم دولھا میاں کی آواز بھی کئی بار سن چکی تھیں۔ کیونکہ وہ برابر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آجا رہے تھے۔ بلکہ کئی مرتبہ انہیں کن انکھیوں سے بھی دیکھا تھا۔ ماشاء اللہ گبھرو جوان تھے۔ دھم دھم کرتے چلتے تھے۔ آواز میں حکومت اور رعب دونوں چیزیں موجود تھیں۔ دلھن بیگم کو اگر کچھ فکر تھا تو یہی کہ نہ جانے ان کا مزاج کیسا ہوگا۔ یہ حال تو ساتھ رہنے سہنے سے ہی کھلتا ہے۔ لیکن دولھا میاں نے ایک ایسی حرکت کی کہ اپنے مزاج کی اصلیت خود

ہی ظاہر کردی آج بھی دولھن بیگم کئی جوان بیٹے بیٹیوں کی ماں اور نواسوں پوتوں کی دادی نانی ہیں لیکن اپنے میاں سے اس درجہ مرعوب ہیں کہ آج تک انہوں نے کبھی اپنے میاں کی بات نہیں پلٹی۔

ہاں تو وہ عجیب حرکت کیا تھی جس نے ان بی بی کے مزاج کو ایک دم بدل دیا۔ اور بدلا بھی ایسا کہ کبھی ہوں سے چوں نہیں کی۔ سنئے اس گھر میں کسی ہمسائے کی بلی آجایا کرتی تھی۔ یہ بلی نہ اجنبی تھی نہ پلی ہوئی۔ گھر میں میاؤں میاؤں کرتی پھر رہی تھی، دولھا میاں نے جو بلی کی میاؤں میاؤں سنی۔ لال پیلے ہی تو ہو گئے۔ "کہاں سے آگئی یہ نامراد" کہہ کر گرجے بزرگوں کی نشانی، بڑے بڑے معرکے مارنے والی تلوار صحنچی میں ٹنگی تھی۔ لپک کر نیام سے نکالی اور بلی پر ایک ایسا بھرپور وار کیا کہ بچاری فوراً ملک عدم کو چل دی۔

دولھن بیگم نے یہ سب واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا سمٹ گئیں سہم گئیں۔ خوف سے کانپتے ہوئے ایک آدھ آنسو بھی ٹپکایا۔ لیکن جناب وہ دن اور آج کا دن، خیر سے دولھا میاں ساٹھ برس کے ہیں، لیکن وہی رعب داب قائم ہے۔

جناب اسی اصول پر نوزائیدہ بچہ کاربند ہے، بچہ کیا ہے؟ ایک گوشت کا لوتھڑا! بے حیثیت، بے اقتدار، گردن اپنے سہارے نہیں ٹکتی۔ آنکھ جم نہیں سکتی۔ ہاتھ پاؤں پر اختیار نہیں، لیکن پھر بھی اس کے اشاروں پر بڑے بڑے بھاگتے ہیں۔ جہاں روں

روں شروع کی، ماں بھاگی، باپ دوڑا، خالہ لپکی غرض پلٹن کی پلٹن حرکت میں آگئی، اب آپ منطقی نتیجہ مرتب کیجیے، بچہ بے بضاعت کمزور، لیکن اقتدار اس قدر مستحکم اس کا سبب کیا ہے؟ صرف رونا۔

میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ ایک دوست آگئے، یہ بیچارے جب کبھی اپنی بیگم صاحبہ کی سختیوں سے بہت ہی تنگ آجاتے ہیں تو گھنٹہ دو گھنٹے سکونِ قلب حاصل کرنے کے لئے میرے پاس تشریف لے آیا کرتے ہیں۔ جب وہ میرے کمرے میں آگئے تو سمجھ لیجئے کہ آندھی کا ایک ہلکا سا جھونکا آگیا۔ یہ کتاب اٹھا، وہ کاغذ دیکھ۔ یہ پڑھ، وہ پلٹ، غرض میرے کمرے کا نقشہ چند ہی لمحوں میں اس طرح بدل جاتا ہے جیسے آج کل یورپ کا نقشہ بدل رہا ہے، میں فطرۃً رحم دل ہوں سختی میرا شعار نہیں، پھر اس جورو کے ستائے ہوئے انسان کو ویسے بھی کچھ کہنے سننے کو جی نہیں چاہتا۔ ہاں تو ان حضرت نے میرے مضمون کے پہلے دو صفحے پڑھ لئے، اور مجھ سے بات کئے بغیر سیدھے اپنے گھر کی طرف چل دیئے۔ دھم دھم کرتے اپنے کمرے میں پہنچے، کپڑے اتارے، صرف اتنے کپڑے اپنے جسم پر رہنے دیئے، جتنے ان کے صاحب زادے کے جسم پر تھے، لیٹ گئے، انگوٹھا منہ میں لے لیا، اور لگے ایڑیاں رگڑنے اور ننھے میاں کی طرح روں روں کرنے،

بیوی نے جو یہ نئی قسم کی روں روں سنی تو آگ بگولا ہوگئیں۔ چیل کی طرح کمرے میں آئیں، انہوں نے کیا کیا اور کیا ہوا؟ یہ مجھے خوب معلوم ہے۔ میاں بیوی کا قصہ میں اجنبی لوگوں کو کیوں سناؤں؟ صرف اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ آپ ذرا احتیاط فرمائیں اور کبھی بھولے سے بھی ننھے میاں کی نقل اتارنے کی کوشش نہ کریں۔ بہر حال آپ رنجیدہ نہ ہوں، رونے کی ہزاروں قسمیں ہیں۔ ہر ملک و ملت اور ہر ملک کے مرد عورت کے لئے رونے کے سامان بآسانی مہیا ہو سکتے ہیں۔ اور بوقتِ ضرورت ان سے استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

کسی کا مقولہ ہے "رونا گانا دنیا میں کسے نہیں آتا" یہ کہاوت بہت مشہور ہے لیکن ہے بالکل لغو، کیونکہ رونے اور گانے میں کوئی تعلق اور مناسبت نہیں، اگر آپ کو ایک بات آتی ہو تو ضروری نہیں کہ دوسری بھی آجائے، یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ جیسے ایک گلہری اور دوسرا بکرا، صاحب اچھٹانک آدھ پاؤ گھی روزانہ صبح صبح بادام کے شیرے میں بگھار کے نوش فرمائیے۔ دو چار تولے شیر کی چربی گردن اور سینے پر ملئے۔ پھر خوب گلا پھاڑ کر اونچی نیچی اور ہلکی اور زہر کی آوازیں نکالنی شروع کر دیجئے یہی گانا ہے، گلیوں میں، سڑکوں پر، جو تان سین زادے صبح و شام نغمہ پاشی کرتے پھرتے ہیں۔ البتہ شیرہ بادام اور گھی کا بگھار انہیں میسر نہیں آتا، سردی میں غسل کرنے سے پہلے

اور اکثر عین غسل کے دوران میں آپ جو مختلف قسم کی آوازیں نکالتے ہیں وہ کھرج کے سُروں میں ہوتی ہیں۔ گویا وہ گاتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لٹو کے منہ پر سیٹی لگادی ہے اور وہ نہایت تیزی سے گھوم رہا ہے، گویا آآ اور ای ای ہا چلیئے یہ اعلیٰ قسم کا گانا ہوگیا۔ یعنی فن موسیقی کا اعلےٰ نمونہ،

لیکن رونا...... بچہ پیدا ہوتے ہی روتا ہے۔ دنیا گواہ ہے کہ بچوں کا رونا بالکل صحیح قسم کا رونا ہے۔ پھر بڑے ہو کر ہمجولیوں سے لڑ پڑے، یا کہیں پاؤں پھسل گیا اور وہیں رو دیئے۔ یہ بھی بالکل ٹھیک قسم کا رونا ہے۔ ہوش سنبھالتے ہیں تو مدرسے میں داخل ہوتے ہیں۔ وہاں ماسٹر جی کے سخت سخت ہاتھوں سے پٹتے ہیں! اور رو دیتے ہیں اس رونے کو بھی صحیح قسم کا رونا سمجھنا چاہیئے۔ پھر کالج کے زمانے میں جب ماشاءاللہ فیل ہوتے ہیں یا مرض لا دوا یعنی عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تو بھوٹ بھوٹ کر روتے پھرتے ہیں۔ یہ بھی باون تولے پاؤ رتی صحیح قسم کا رونا ہوتا ہے۔ غرض جوانی میں بڑھاپے میں حتیٰ کہ خود اپنی موت پر، یعنی ہر موقعے پر جب بھی کوئی بچہ جوان، بوڑھا، زندہ، مردہ، عورت مرد آپ، وہ یعنی کوئی بھی روتا ہے تو بالکل صحیح قسم کا رونا ہوتا ہے۔ یہ ہے آرٹ کی خوبی کہ ہر شخص خود بخود رونا سیکھ جاتا ہے اور مکمل طور پر سیکھ جاتا ہے۔ آرٹ کے اس پہلو کو نہایت اختصار اور ایجاز کے ساتھ مرزا غالب نے یوں نظم فرمایا ہے ؎

نالہ پابندِ نَے نہیں ہے   فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے

ذرا آرٹ کے ایک اور پہلو سے رونے پر غور فرمائیے۔ آپ ہنستے ہیں تو چہرہ چپٹا ہو جاتا ہے۔ ہچ ہچ کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ آنکھیں ہیں کہ اُبلی پڑتی ہیں۔ دہانہ ہے کہ کھنچ کر کانوں سے جا ملتا ہے۔ ماتھا سکڑ جاتا ہے ابرو پھیل جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، توازنِ حیات بگڑ گیا۔ اب روتے ہوئے چہرے کو دیکھئے۔ ذرا لمبوترا ہو گیا گویا گلاب کا پھول کملا گیا۔ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ سرخ سرخ ڈورے چمکنے لگے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ سو سال پرانی شراب ابریق سے چھلکنے والی ہے، چہرے کے رگ و ریشے ملائم پڑ گئے۔ حدت گریہ کی سرخی گالوں پر آ گئی، ہونٹ خشک ہو گئے...... اگر آپ جمالیات سے کچھ بھی دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ خود ہی کہہ دینگے کہ روتے ہوئے اور ہنستے ہوئے چہروں کا کوئی مقابلہ نہیں۔

حسن دنیا میں روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اس لئے اگر ہماری کوئی کوشش حسن میں اضافہ کرے، بدصورتی کے عیبوں کو ڈھانپے اور حسن کو اجاگر کرے تو وہ کس قدر خوش آئند اور قابل قدر ہے؛

جب آپ بازار میں کوئی چیز خریدنے کے لئے جاتے ہیں تو ہمیشہ یہ بھی مدِنظر رکھتے ہیں کہ مطلوبہ چیز دیرپا ہو۔ یاد رکھئے نئی تحقیقات کے مطابق رونا بھی حسن

کی پختگی اور از دیاد کا ایک عمدہ ذریعہ ہے یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آنسو نمکین ہوتے ہیں۔ کم از کم بچپن میں آپ نے آنسوؤں کا مزہ ضرور چکھا ہوگا۔ اب یہ نکتہ بھی سن لیجئے، کہ نمک پانی سے منہ دھونے سے رنگ صاف ہو جاتا ہے گویا آنسو حسن بڑھانے میں اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر اس جدید نظریے پر آپ کو یقین نہیں تو تجربہ کر کے دیکھ لیجئے

رونے کی خوبیاں سن کر ضرور آپ کا جی چاہتا ہوگا کہ وہ ذرائع بھی دریافت کریں جن سے رونے میں مدد ملتی ہے ان سب کا مفصل بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں البتہ دو ایک باتیں سن لیجئے۔

آج کل ہر گھر میں کم و بیش یہ تین چیزیں یعنی بیوی، بچے اور ریڈیو موجود ہیں۔ ہر نسخے کی خوبی یہ ہے کہ اس کے اجزا آسانی سے دستیاب ہو سکیں۔ اس لئے جو نسخہ میں تجویز کرونگا! اس میں جزو اعظم یا تو بیوی ہوگی یا ریڈیو یا بچے۔ بچے عام طور پر خود ہی روتے ہیں اور رلانے کے کام ذرا کم کرتے ہیں۔ چونکہ ریڈیو ابھی اس قدر عام نہیں ہوا جس قدر بیویاں عام ہیں، اس لئے میں پہلا نسخہ "گریہ کوفتہ و پختہ" عرض کئے دیتا ہوں۔

نمبر ا۔ یہ نسخہ بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔ آپ کی بیوی۔ اپنی بیوی کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، زود اثر ہوگی۔ ان سے فرمائش کیجئے کہ بہت دنوں سے

آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا کچھ نہیں کھایا۔ ایک ہنڈیا آج خاص طور پر پکا دیں۔

فرض کیجیے آپ کی یہ درخواست منظور ہو گئی، کھانے کی میز پر خوشی خوشی آ بیٹھیے، اور سب سے بے رونق اور بدذائقہ چیز کے متعلق دریافت کیجیے کہ یہی بیگم صاحب کے دستِ خاص کی پکی ہوئی ہے ہاول تو آپ کا یہ خیال صحیح ثابت ہو گا۔ اگر سوء اتفاق سے ایسا نہ ہو تو اُن کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیز کے متعلق غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار کر دیجیے۔ انشاءاللہ تعالےٰ آج کی رات سے دوسرے دن کے بارہ بجے تک آپ کے رونے کا پورا پورا انتظام ہو جائے گا۔

اور جناب جن گھروں میں بیوی اور ریڈیو دونوں چیزیں موجود ہوں وہاں صاحب خانہ۔ ریڈیو والا نسخہ استعمال فرما سکتے ہیں۔ بلکہ مناسب یہی ہے کہ صرف اسی نسخے کو استعمال کریں۔

ریڈیو والے نسخے کا صحیح طریقۂ استعمال بھی سُن لیجیے:۔

ساڑھے سات بجے شام کے ایک کرسی پر بیٹھ جائیے۔ کرسی آتش دان کے قریب ہو اور آتش دان میں خوب آگ جل رہی ہو۔ پروگرام کی کتاب کھولے بغیر ریڈیو چلا دیجیے۔ آپ ماشاءاللہ سنجیدہ آدمی ہیں۔ اس وقت تقریر ہو رہی ہو گی۔ اور تقریر کا مضمون ضرور ایسا ہو گا۔ جسے تقریر کرنے والے سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ اس

میں تقریر کرنے والے کا قصور نہیں۔ ریڈیو پر اکثر تقریریں مضمون کی وجہ سے نہیں کی جاتیں" اگر آپ چند جملے سُن کر رو نہ دیں تو ہمارا ذمہ۔ پھر تھوڑی دیر میں کسی اور چیز کی باری آ جائے گی۔ وہ موسیقی ہو گی یا گانا۔ اس سے آپ کے رونے کی کفالت ہو جائے گی۔

اور پھر جب ایک بار شروع ہو گئے تو پھر بقولِ میر تقی مرحوم ؎

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے کوئی ہنسی نہیں ہے

فی الحال میں نے صرف دو تین نظریوں پر اصولی اور منطقی طریقِ استدلال سے روشنی ڈالی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کو آج ہی آزما لیں۔ بقول میر انیسؔ مرحوم رونا عجیب شے ہے:۔

رُباعی

آئینۂ خاطر کی جِلا ہے رونا　　اور دیدۂ مردم کی ضیا ہے رونا
پوچھا جو علاجِ دل مسیحا نے کہا　　ہر درد کی دنیا میں دوا ہے رونا

ہیڈ ماسٹر

ہیڈ ماسٹر

اجی ماسٹر صاحب، ماسٹر صاحب، بات سنو بھائی، بندۂ خدا۔ کتنی دیر سے پکارتا چلا آرہا ہوں اور تم ہو کہ پلٹ کر دیکھتے ہی نہیں۔

دیکھو پٹواری جی تم اس گاؤں کے پٹواری ہو اور میں ہمیشہ پٹواری جی ہی کہہ کر تمہیں مخاطب کیا کرتا ہوں، میں پرائمری سکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں اس لئے حقدار ہوں کہ آپ بھی مجھے ہیڈ ماسٹر صاحب کہہ کر پکارا کریں۔

اچھا ہیڈ ماسٹر صاحب معاف کیجیے۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔

نہیں بھائی غلطی کی بات نہیں ہے۔ کبھی ڈپٹی صاحب کو بھی تحصیلدار کہہ کر پکارو تو دیکھو کیا مزہ آتا ہے۔ ایک ڈپٹی صاحب میرے ہم وطن ہیں۔ وہ ایک بار ایسا ہوا کہ میں تعطیلات میں گھر گیا ہوا تھا اور وہ بھی چھٹی پر آئے ہوئے تھے، ایک دن میں سلام کرنے گیا تو وہ بولے۔ ماسٹر جی۔ گھنٹہ بھر کے لئے میرے بچے کو حساب پڑھا جایا کرو۔ لو صاحب میں انکار نہ کر سکا۔ اب ڈپٹی صاحب کے ہاں روز کا آنا جانا ہو گیا۔ ایک

دن دیکھتا کیا ہوں۔ ڈپٹی صاحب دوپہر کا کھانا بیٹھک میں اکیلے بیٹھے کھا رہے ہیں اور تیور غصّے کے بنے ہوئے ہیں۔ میں نے لڑکے سے پوچھا۔ میاں آج کیا بات ہے۔ ڈپٹی صاحب کچھ خفا سے دکھائی دیتے ہیں۔ معلوم ہوا جب سے تحصیلداری سے ترقی کر کے ڈپٹی صاحب ہوئے ہیں۔ اُن کا سخت حکم ہے کہ اندر باہر انہیں سب ڈپٹی صاحب کہہ کر پکارا کریں۔ آج ان کی بیوی نے انہیں مسعود کے ابا کہہ کو مخاطب کر لیا۔ بس صاحب پھر کیا تھا بپھر گئے۔ کہنے لگے مسعود تو ماسٹر کے لڑکے کا نام بھی ہے۔ کیا تم ماسٹر کو پکار رہی ہو۔

بیوی نے کہا۔ اے نوج میں ہوئے ماسٹر کو پکاروں۔ میں تو تمہیں بلا رہی تھی،

"لیکن میں تو ڈپٹی صاحب ہوں"

"ہے ہے ڈپٹی صاحب ہو تو کیا مسعود کے ابّا نہیں رہے"؟

"جی نہیں میں ڈپٹی صاحب ہوں۔ سوتے ہوئے بھی اور جاگتے ہوئے بھی۔ گھر میں بھی اور باہر بھی، اوروں کے لئے بھی اور تمہارے لئے بھی"۔

بات بھی قاعدے کی ہے پٹواری جی! میری بیوی بھی مجھے مسعود کے ابا کہہ کر تھوڑا ہی پکارتی ہے۔ ہمیشہ "ہیٹ ماسٹر صاحب" کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ اسے بہت سمجھایا کہ یہ لفظ ہیٹ ماسٹر نہیں ہے ہیڈ ماسٹر ہے۔ ہیڈ کہتے ہیں سر کو۔ اور جو

سب ماسٹروں کا افسر ہو، اسے ہیڈ ماسٹر کہتے ہیں۔ خیر وہ تو ٹھیری اَن پڑھ جاہل لیکن پٹواری جی تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو، اپنوں کی عزت تم ہی نہیں کروگے تو اور کون کرےگا۔

پٹواری جی نے کہا۔ اچھا ہیڈ ماسٹر صاحب! آئندہ احتیاط کرونگا۔ اس وقت تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نمبردار کے لڑکے کو ترقی دے ہی دو۔

ضرور پٹواری جی۔ دیکھو میں کوشش میں تو لگا ہوا ہوں کہ وہ اس سال اگلی جماعت میں چڑھ ہی جائے تو بہتر ہے۔

میں پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں اور میرا کام علم اور عقل کی روشنی پھیلانا ہے بیس سال ہوئے میں نے ٹریننگ سکول میں پڑھا تھا کہ مدرسین کا فرض بچوں کی تدریس ہی نہیں ہے بلکہ گاؤں والوں سے تعلقات پیدا کرکے ان کو علم و عقل سکھانا بھی ہے۔ میں ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ جہاں کہیں تبدیل ہوکر جاتا ہوں۔ وہاں کے ذیلدار، نمبردار، داروغہ، پٹواری، چنگی کے منشی گاؤں کے ڈاکٹر غرض سبھی سے راہ و رسم پیدا کرلیتا ہوں، سال ہا سال کی بات ہے میں شاہ آباد تبدیل ہوکر گیا۔ ایک دن میں داروغہ جی سے ملنے چلا گیا۔ بیچاروں کی کشتی پنشن کے کنارے آگی تھی، تھے بڑے بھلے آدمی، بڑی محبت سے پیش آئے اور مجھے نوجوان پاکر نصیحتیں کرنے لگے۔

"دیکھو ماسٹر جی میں کانسٹیبلی سے ترقی کرکے داروغہ ہوا ہوں، یہ اللہ کی مہربانی

ہے۔ لیکن مجھے جفاکشی کی ہمیشہ سے عادت رہی ہے۔ اور پہلے افسر بھی کچھ اچھے ہی ہوتے تھے۔ ہمیشہ ماتحت کو ابھارنے اور اچھالنے کی فکر میں لگے رہتے تھے، کرپی صاحب کپتان پولیس تھے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی لاتیں ہی کھا کر ہمیں کام کرنے کا سلیقہ آیا۔"

دوسرے دن گرداور رقانونگو صاحب سے ملنے گیا۔ وہ بھی بیچارے بڑے بھلے مانس لوگ تھے، دیر تک باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں کہا۔ میاں یہ سب کچھ محنت کا ظہور ہے کہ ہم آج گرداور صاحب بنے بیٹھے ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ افسروں کی لاتیں کھا کھا کر ترقی نصیب ہوئی ہے۔

اسی روز ذیلدار صاحب سے ملاقات ہوئی بھئی یقین مانو بڑی شان کی ذیلداری کرتے تھے، ان کی سفارشیں ڈپٹی کمشنر تک سنی جاتی تھیں۔ علاقے میں بڑا رعب داب تھا۔ میں نے جب ان کی اقبال مندی کا ذکر کیا۔ تو فرمایا ماسٹر جی کیا بتائیں اب ہمارا لڑکا تو کام سے جی چراتا ہے۔ کسی کی کڑی بات سہہ ہی نہیں سکتا۔ اور بھائی ہم تو ہر آنے جانے والے افسر کی اردل میں جتے رہتے تھے، جانے کس کس کی لاتیں کھائیں تو ذیلداری نصیب ہوئی۔

ان تین بزرگوں کے کامیاب تجربوں سے یہ بات قطعی طور پہ واضح ہو گئی کہ زندگی میں ترقی صرف لاتیں کھا کر ہی ہو سکتی ہے۔

مہینہ بھر بعد ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب دورے پر آئے، ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ وہ حال ہی میں اسسٹنٹی سے ڈسٹرکٹ انسپکٹر ہوئے تھے، بالکل نئی قسم کے افسر تھے، میں ہر طرح سے خدمت میں حاضر تھا ہی۔ اس ضلعے میں نئے نئے آئے تھے، اپنے ضلعے کے کچھ حالات سنانے لگے، مدرسوں میں جو جو اصلاحات انہوں نے کی تھیں، ان کا ذکر کرتے رہے۔ پھر بولے دیکھو ماسٹر جی ہمیں جو یہ ترقی ملی ہے ....

میں نے فوراً بات کاٹ کر عرض کیا۔ ہاں حضور میں خوب سمجھتا ہوں حضور نے ترقی لاتیں کھا کر ہی کی ہو گی۔

ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر بولے۔ خیر اب جائیے، اور آپ آرام کیجئے۔ لو صاحب اسی مہینے ہمارا تبادلہ ہو گیا۔ حاکم کا حکم کر ہی کیا سکتے تھے۔ اور سچ پوچھئے تو میں ابتدائے ملازمت سے ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ جب میں نوکر ہوا تھا۔ اس وقت کی باتیں اب تک یاد ہیں۔ لیکن وہ زمانے ہی کچھ اچھے تھے! اور پھر میں تو ایک خاندانی ہیڈ ماسٹر ہوں۔ گویا میرے والد صاحب بھی ہیڈ ماسٹر صاحب تھے وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر مع گھر بار کے وطن چلے گئے تھے، اتفاق کی بات ہے۔ میں اسی مدرسے میں نائب مدرس مقرر ہوا۔ لالہ گیان سروپ نے جو والد صاحب کی جگہ ہیڈ ماسٹر ہوئے تھے۔ مجھ پر خاص مہربانی کی اور وہیں مدرسے کے اندر مجھے ایک کوٹھڑی

دے دی ۔ اس وقت تک میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی ، اکیلا آدمی تھا ، میرے لئے وہ کوٹھڑی بہت کافی تھی ، مہینہ بھر کے بعد میں نے کچھ مرغیاں پال لیں ۔ انڈے ونڈے کھانے کو ہو جاتے تھے ، دوسرے مہینے ایک بکری لے لی ۔ اس کے دودھ سے بڑا آرام تھا ، مشکل ایک سال گزرا ہوگا کہ میں نے ایک گائے خرید لی ، اب میں نے گاؤں میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا ۔ جناب صرف اٹھارہ روپے ملتے تھے ۔ لیکن خدا جانے کیا برکت تھی ان روپوں میں ۔ دس روپے گھر بھیج دیتا تھا ۔ آٹھ روپے میں اپنا کھانا پینا ۔ کپڑا لتا ۔ تھوڑا بہت لین دین ۔ بنج بیوپار ۔ غرض سبھی کچھ ہو جاتا تھا ۔ پانچ چھ مہینے میں کرم داد کے باپ کو اپنی گائے اور اس کے علاوہ بیس روپے دیئے ۔ اور صاحب ایک بھینس خرید لی ۔ اب گھر میں چھوٹی موٹی آرام کی دس اور چیزیں یعنی مرغیاں ، بکری اور بھینس موجود تھی ۔ ادھر والد صاحب تقاضا کر رہے تھے کہ شادی کر لو ۔ آخر کار میں بھی راضی ہو گیا ۔ اسی گاؤں کی ایک لڑکی سے شادی ہو گئی ۔ تین سال کے اندر اندر اللہ میاں کی مہربانی سے سبھی کچھ نصیب ہوا ۔ لیکن مثل مشہور ہے ۔ خوش حال کے سو دشمن ۔ کسی نے ایک گمنام عرضی چلتی کی ۔ اچھی خاصی بات بڑھ گئی ۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب نے تحقیقات شروع کی ۔ لیکن کوئی بات ہوتی تو نکلتی ۔ کام میرا بہت اچھا تھا ۔ بس اور تو کچھ ہوا نہیں ۔ البتہ مڈل سکول سے ایک پرائمری سکول کا ہیڈ ماسٹر کر کے میرا تبادلہ کر دیا ۔ خیر تن بتقدیر ۔ ہم حاکم کا حکم

بجا لائے۔

اب منکہ پرائمری سکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں اس لئے میرا مقولہ ہے " ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" اللہ کی مہربانی سے سال چھ مہینے کے اندر اندر سب کچھ غریبانہ آرام اور آسائش یہاں بھی میسر ہو گیا۔ پر جناب سچی بات تو یہ ہے کہ پرائمری سکول کی ہیڈ ماسٹری کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ بڑی جفاکشی اور ذمہ داری کا کام ہے۔ آپ تو یہ سمجھتے ہونگے ایک یا دو ماسٹر صاحبان ہونگے اور چار جماعتیں۔ لیکن جناب خدا جانے کتنے رجسٹر رکھنے پڑتے ہیں۔ اور جبری تعلیم کے سلسلے میں لڑکوں کی فہرستیں بناؤ۔ ان کے ان پڑھ ماں باپ کو سمجھاؤ۔ ان کوڑ مغزوں کو مار کوٹ کر پڑھاؤ۔ حاضری کی تعداد پوری رکھو اور نجانے کیا کیا کرو۔ اب ہوا اور چلی ہے جو افسر معائنہ کرنے آتا ہے وہ یہی راگ الاپتا آتا ہے کہ کھیل کھیل میں تعلیم دو۔ بچوں کو مارو پیٹو بالکل نہیں۔ ذرا آپ غور فرمائیں لاتوں کے بھوت بھی باتوں سے مانتے ہیں۔ ہم پڑھانے بیٹھتے ہیں۔ الف سے اونٹ اور بے سے بکرا۔ لڑکا اونٹ اور بکرے ہی کو دیکھتا رہتا ہے اور الف ب کو خدا کی قسم بالکل بھول جاتا ہے لیکن ایک قمچی رسید کر دیجئے، پھر دیکھئے۔ اونٹ اور بکرا تو غائب ہو جاتا ہے اور الف بے یاد رہ جاتی ہے۔ اب صاحب ہوشیاری کا کام یہ ہے کہ روزمرہ تو پڑھاؤ قمچی کے زور سے مگر جب آئیں معائنے کے افسر تو اتنے زیادہ کھیل کھلونے بچوں کے آگے ڈال دو

کہ دیکھنے والے کی سٹّی گم ہو جائے، اس طرح معائنے کے افسر صاحب سمجھتے ہیں کہ کام بہت ہی ٹھیک ہو رہا ہے۔ فرماتے ہیں "دیکھا ماسٹر صاحب! یہ نئے طریقۂ تعلیم کی برکت ہے کہ لڑکے سو فیصدی ترقی کرتے ہیں اور آپ کو بھی محنت کم کرنی پڑتی ہے۔" میں عرض کرتا ہوں "بجا ہے حضور!" لیکن دل ہی دل میں کہتا ہوں کہ صاحب یہ برکت ہے قینچی شریف کی۔ بہرحال میاں ہمیں آم کھانے سے غرض ہے پیڑ گننے سے کیا مطلب؟

مگر بعضا بعضا معائنے کا افسر بھی بڑا کائیاں ہوتا ہے۔ ایسی ایسی کرید اور چھان بین کرتا ہے اور ایسی ایسی مین میخ نکالتا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ لیکن میں بھی جناب پرائمری سکول کا پرانا ہیڈ ماسٹر ہوں، اس کا بھی توڑ خوب جانتا ہوں۔ جہاں دو چار دفعہ کہا کہ حضور ہی کے اقبال سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ بھلا فدوی کس قابل ہے۔ بس صاحب! حضور کی سب تیزی رفوچکر ہو جاتی ہے۔

سانپ کے کاٹے کے لئے زہر مہرہ اور تریاق جو خاصیت رکھتے ہیں، وہی اثر "حضور کے اقبال" کا بار بار اعادہ اور "قیام و طعام کا بہتر انتظام" کرتا ہے البتہ ایک مرتبہ میں عجب چکر میں پھنسا تھا۔

دریائے چناب سے چند میل کے فاصلے پر پکی سڑک کے کنارے میں ایک پرائمری سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ دن کے کوئی گیارہ بجے ہونگے۔ میں مدرسے کے سامنے

چبوترے پر حقہ لگائے میز پر ٹانگیں جمائے بڑے مزے سے بیٹھا تھا۔ میرے پاس ہی چارپائی پہ گاؤں کے چند زمیندار بیٹھے تھے۔ یہ لوگ اپنے مویشیوں کو کانجی ہاؤس سے چھڑانے آئے تھے۔ مویشی خانہ کا انچارج میں تھا۔ میں نے اپنے نائب مدرس کو مویشیوں کی فہرست بنانے اور چھوڑ دینے کے لئے بھیج رکھا تھا۔ چاروں جماعتوں کے لڑکے ادھر ادھر کلیلیں کرتے پھرتے تھے۔ اتنے میں ایک صاحب انگریزی لباس پہنے، ننگے سر میری کرسی کے پاس آکھڑے ہوئے، اور فرمانے لگے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب آپ ہی ہیں؟ میں نے کرسی پہ بیٹھے بیٹھے گردن ہلا کر کہا "جی ہاں" وہ فرمانے لگے میں آپ کا مدرسہ دیکھنا چاہتا ہوں، یہ سُن کر میں کھڑا ہو گیا۔ میں یہ سمجھا کہ یہ صاحب محکمۂ سول کے کوئی افسر ہوں گے وہ آگے آگے اور میں ذرا پیچھے پیچھے، مدرسے کی عمارت میں داخل ہوئے، ایک کمرے میں کچھ جلانے کی لکڑیاں پڑی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا، یہ کیا ہے؟ میں نے بے تکلفانہ عرض کیا۔ "سوختنہ"

"یہاں کیوں ہے؟"

معائنہ کے افسر صاحبان کبھی کبھار، رات بے رات تشریف لے آتے ہیں۔ اس علاقے میں سردی بہت سخت ہوتی ہے۔

دوسرے کمرے میں دو ٹین کے پیپے جن میں تھوڑا بہت گھی بھی تھا۔ دیکھ کر

میری طرف پھر نگاہِ استفسار ڈالی، میں نے عرض کیا۔

"حضور یہ میرے نہیں ہیں، یہ بھی محکمے کے افسروں ہی کے ہیں"

بس صاحب! یہ جواب سن کر انہوں نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا اور مجھ سے عہد لیا کہ آئندہ میں سیج پہ پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرونگا۔

جب مدرسے کی عمارت سے باہر نکل کر آئے تو ان کی موٹر اور ملازمین بھی پہنچ چکے تھے، اب مجھے پتہ چلا کہ یہ مدرسوں کے نئے بڑے انسپکٹر صاحب ہیں۔ اگرچہ انہوں نے معائنہ کی رپورٹ میں کوئی بات میرے خلاف نہیں لکھی، لیکن میں نے اس دن سے عہد کر لیا کہ آئندہ اپنے لئے مدرسے میں ایندھن جمع کرنے کے بجائے براہ راست گھر بھیج دیا کرونگا۔ گھی کا بیوپار بھی بادلِ ناخواستہ بند ہی کر دونگا اور چوتھی جماعت میں اپنی میز کے سامنے یہ دو مقولے لکھوا کر لٹکوا دونگا۔

"ہمیشہ سچ بولو"۔ اور۔ "سانچ کو آنچ نہیں"

ایک مزے کی بات اور یاد آگئی۔ ایک دن سب سے چھوٹے انسپکٹر صاحب آئے، آدمی بڑے گھاگ تھے۔ سخت قسم کا معائنہ کیا، لیکن میں نے بھی ہر طرح سے انہیں خوش کر دیا۔ شومئی قسمت! ان کے لئے جو پلنگ مہیا کیا گیا۔ وہ تھا تو نواڑی، لیکن ایک مدت سے بند پڑا تھا۔ اس لئے اس میں لاتعداد کھٹمل پیدا ہو گئے تھے، خدا گواہ

ہے، مجھے اس بات کا مطلق علم نہ تھا۔ بس صاحب رات بھر بیٹھے پٹا پٹ کھٹمل ہی مارا کئے، صبح کو جو دیکھتا ہوں تو تیور بدلے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی "حضور کے اقبال" اور "فدوی" کا عمل شروع کر دیا۔ پھر کہیں جا کر بگڑی بات بنی۔

اگرچہ میں ہوں تو پرائمری سکول کا ہیڈ ماسٹر لیکن بیسیوں اور فرائض بھی میرے ذمہ ہیں۔ گیہوں اور کپاس کے اعلیٰ قسم کے بیجوں کا پرچار میرے ذمہ ہے۔ مکھی اور مچھر کے خلاف اعلانِ جنگ میرے نام سے ہوتا ہے۔ چیچک کے ٹیکے کا پروپیگنڈا میں کرتا ہوں، غرض دیہات سدھار کے جتنے کام ہیں۔ وہ میرے ہی سپرد ہیں۔ اب تعلیم بالغان کا بھی بہت زور ہے۔ بڑے بڑے افسر بھی اپنی کارگزاری کا معیار یہی سمجھ بیٹھے ہیں کہ ناخواندہ کو خواندہ بنا دیا جائے اور جب سے ہٹلر نے تباہی مچائی ہے بھرتی والوں کی مدد بھی ہمیں لوگ کرتے ہیں، ان کاموں کے علاوہ گاؤں کے ڈاک خانے کا انتظام بھی میرے سپرد ہے۔ کہنے کو سات روپے ماہوار الاؤنس ملتا ہے پر کام ہوتا ہے بیس روپے پانے والے بابو کا۔ جنگی کے مویشی خانے کی نگرانی بھی میرے سپرد ہے۔ تین چار روپے اس کے بھی وصول ہو جاتے ہیں لیکن ذرا زندگی کے اس طور کو دیکھئے چاروں طرف ڈھور ڈنگر۔ گاؤں کے اَن پڑھ مرد اور عورتیں اور ان سے بھی زیادہ اور کند ذہن اُن کے بچے۔ قصہ مختصر یہ سب آفاتِ ارضی ایک طرف اور ایک ننھی سی جان دوسری طرف، مگر جناب خدا گواہ ہے کہ اس پوری گزارش سے مدعا

شکوہ اور شکایت ہرگز نہیں۔ ہماری تنخواہیں قلیل سہی۔ ہمارا کام سخت اور دشوار سہی، لیکن یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ہم لوگ بنی نوع انسان کی خدمت کر رہے ہیں ؎

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

پروفیسر

پروفیسر

ایک دوست میرے ہاں مہمان ٹھیرے ہوئے ہیں۔ ان کا اسم گرامی پروفیسر ہیچمدان ہے، میری ان سے بڑی پرانی ملاقات ہے، جس سال انہوں نے پہلی بار میٹرک کا امتحان دیا تھا، میں چھٹی جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ آٹھ سال میرا اُن کا ساتھ رہا یعنی میں ساتویں جماعت میں اور وہ میٹرک میں، میں نویں جماعت میں، وہ میٹرک میں، میں میٹرک میں اور وہ بھی میٹرک میں، پھر میں اور وہ دونوں کالج میں، میں بی۔اے پاس کر کے تجارت کے سلسلے میں کلکتہ چلا گیا، اور وہ کالج میں علم کے خزانے جمع کرتے رہے، کوئی بارہ سال بعد جب میری اور ان کی پھر ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ میرے دیرینہ دوست مسٹر ہیچمدان یورپ کی کسی ڈگری بخش یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری، حال ہی میں لے کر ہندوستان آئے ہیں اور خوش قسمتی سے کسی کالج میں پروفیسر بھی ہو گئے ہیں۔

مدت کے بچھڑے دوست جب آپس میں ملتے ہیں تو ہوش و عقل کی باتیں نہیں کرتے۔ محبت کا جوش ایک سانس میں دس دس سوال کرنے پر مجبور کرتا ہے، اور

دوسرا دوست بھی دس میں سے ایک سوال کا جواب دینے کے بدلے خود دس سوال کر ڈالتا ہے، خیر دو ایک ملاقاتوں کے بعد ہماری بدحواسی دور ہوگئی، لیکن مجھ پر پروفیسر ہیچمدان کی ڈگری کا رعب پوری طرح طاری تھا، میں کاروباری آدمی، وہ علم کے سمندر، وہ سات سمندر پار کے پڑھے ہوئے، پی۔ ایچ۔ ڈی، اور میں صرف ہندوستان کا بی۔ اے پاس، بہرحال ایک دن، میں نے ہمت کرکے یہ سوال کر ہی ڈالا "ڈاکٹر صاحب! یہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے آپ نے کس موضوع پر مقالہ لکھا تھا؟ عالم جاہل کو کیا سمجھائے، اندھے کو بہارِ علم کا رنگ روپ کیونکر دکھلائے، لیکن میرے دوست پروفیسر ہیچمدان نے مجھ پر بے حد کرم کیا، انھوں نے فرمایا۔ تاریخ کے ایک بہت دقیق مسئلے پر میں نے ایک معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی تھی، کچھ جھجکتے ہوئے میں نے پھر دریافت کیا تاریخ کے کس مسئلے پر؟ ڈاکٹر اور پروفیسر ہیچمدان نے —— اب انہیں صرف ہیچمدان کہتے ہوئے ڈرتا ہوں —— فرمایا۔ میرا مضمون اس امر کی تحقیق پر تھا کہ جب شہنشاہ شوں فان دش نے جنوبی چین پر حملہ کیا تو شاہی رسالے کے گھوڑوں کی نعل بندی پر کس قدر روپیہ صرف ہوا؟ نیز یہ کہ نعل بند شاہی فوج کے ہمرکاب تھے یا مقامی طور پر ملازم رکھے جاتے تھے؟ کوئی اور ہوتا تو فوراً کہہ دیتا کہ یہ سب کچھ لغو اور مہمل ہے۔ یعنی کوہ کندن اور کاہ برآوردن، لیکن وہی شخص علم کی قدر خوب کرسکتا ہے جسے یہ معلوم ہو کہ اس کے پروفیسر دوست نے

باوجودیکہ تحصیل علم میں باربار ناکامیوں کا سامنا کیا لیکن اپنی عزیز اور قیمتی زندگی کے تیس سال اور اپنے والدین کا ہزار ہا روپیہ ڈگریوں کے اکھٹا کرنے میں صرف کر ڈالا۔ میں ڈاکٹر ہیچمدان کی علمیت کا قائل ہوں، اللہ ان کے علم کو ان کی اولاد کی طرح...... پروفیسر ہیچمدان کی صرف ڈیڑھ سال کی ایک بچی ہے..... بڑھاتا رہے۔

ہاں تو بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، میرے معزز دوست اور مہمان پروفیسر بلکہ ڈاکٹر ہیچمدان کچھ تحفے تحائف خریدنا چاہتے تھے، اس لئے ہم دونوں بازار کی طرف روانہ ہوئے، پروفیسر صاحب کی اہلیہ محترمہ کی فرمائش مقدم تھی، یعنی پروفیسر صاحب کو ایک ہارمونیم خریدنا تھا۔ مجھ سے مشورہ چاہا۔ لیکن میں تان سین کی بھینس، دیپک راگ بھی ہو جائے تو میرے کان پر جوں نہ رینگے، بس میری سمجھ میں ایک ہی بات آئی، میں نے کہا چلئے کسی جاننے بوجھنے والے کے پاس چلیں۔ اور سب سے زیادہ جاننے والا وہ ہے جو اوروں کو سکھائے۔ میں اپنے دوست پروفیسر ہیچمدان کو لئے ہوئے پروفیسر بھائی سرگم سنگھ صاحب پرنسپل آف دی انٹرنیشنل اکیڈیمی آف میوزک کی خدمت میں پہنچا۔ پروفیسر بھائی سرگم سنگھ صاحب ہارمونیم بناتے ہیں بجاتے ہیں اور سکھاتے ہیں ہم نے اپنی ضرورت عرض کی، بھائی سرگم سنگھ نے راگ ودیا کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے نہایت متانت کے ساتھ چار پانچ باجے دکھائے، اپنے دستِ مبارک

سے بنے ہوئے ہونے کا یقین دلایا۔ اور پھر ایک خاص انداز سے ان باجوں کے سروں پر سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ کی تانیں لیں۔ میں کیا عرض کروں کہ فضا پر اس کے کیا اثرات ہوئے، البتہ ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پروفیسر نے ساڑھے سترہ روپے لئے اور دوسرے نے ہار دیا، کسے معلوم ہے، کس کی فتح ہوئی، کون نفع میں رہا اور کون نقصان میں۔ شاید ذوق مرحوم نے ایسی ہی خرید و فروخت پر یہ شعر موزوں کیا ہوگا ؎

مقدر ہی میں گر سود و زیاں ہے
تو یاں اس نے نہ کچھ کھویا نہ پایا

باجے کی خریداری کے بعد، اپنے دوست کے ہمراہ میں دکان دکان دیکھتا پھرا، کہ شاید کوئی مناسب تحفہ نظر آجائے۔ تحفہ تو نظر کیا آتا، البتہ ایک بہت بڑا بورڈ نظر آیا۔ اس پر اختصار کے ساتھ یہ عبارت لکھی تھی "پروفیسر والمیکی۔ ایکس۔ وائی۔ زیڈ۔ اے۔ بی۔ سی۔ ایم۔ این۔ او۔ وغیرہ وغیرہ نجومی پیشین گو وغیرہ وغیرہ۔ میری نگاہ بورڈ پر پڑی، میں کم علم تاجر جس کا مذہب دو اور دو چار، چار اور چار آٹھ، پروفیسر ہیچمدان ٹھیرے توہم پرست، توبہ توبہ یہ لوگ تو خدا کی ہستی میں بھی مین میخ نکالتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ علم نے علم کو کھینچا، پروفیسر ہیچمدان نے کہا، چلو یار ذرا انہیں ہاتھ دکھلائیں اور کچھ باتیں پوچھیں، میں انکار کیسے کرتا۔ میری گردن میں دوستی کا پھندا اور سر پہ دوست کے علم کا بوجھ،

بہت اچھا کہہ کر ہم دونوں پروفیسر والمیکی کے بالاخانے پر چڑھ گئے، اوپر پہنچتے ہی ایک نوجوان سے مڈھ بھیڑ ہوئی، معلوم ہوتا تھا کہ پروفیسر والمیکی اس نوجوان کو کسی نامعلوم علاقے سے اُچکا کر لائے ہیں۔ بہرحال اس نوجوان کے وسیلے سے پروفیسر صاحب کو اطلاع کرائی، ہم لوگ کمرے میں بیٹھ گئے اور پروفیسر والمیکی کا انتظار کرنے لگے۔ آخر کار وہ آئے۔ دراز قد۔ لمبوترا چہرہ، بڑے بڑے پٹھے، ماتھا کوئی پون انچ کا۔ ابرو بہت ہی گھنے اور جُھتواں، یعنی سر کے بال بھوؤں کے بالوں میں، ماتھا صرف لکیر کی طرح عیاں ناک بھی لمبی لیکن نتھنے بہت زیادہ پھیلے ہوئے، فرنچ کٹ داڑھی خوب نوکدار، پیلے دانت، مجھے ان کو دیکھتے ہی فوراً یقین آگیا کہ ان کے تعلقات ضرور کسی دوسری دنیا کی مخلوق سے ہیں۔ اور وہ ہمارے سب بھیدوں سے واقف اور آنے والی کل کے تمام حالات سے آگاہ ہیں۔ جب پروفیسر والمیکی تشریف لائے تو ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ پروفیسر نے پروفیسر سے ہاتھ ملایا، نگاہیں ملائیں اور گویا آشنائے راز بن گئے، پروفیسر والمیکی مسکرائے، گویا وہ دل ہی دل میں یہ کہہ رہے تھے "پھنسے بچہ۔ کچھ نہ کچھ تو پوچھ ہی گئے۔" میں وہیں بیٹھا رہا اور دونوں پروفیسر اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلے گئے، وہاں جو کچھ ہوا، اس کا ذکر میرے دوست نے مجھ سے نہیں کیا۔

دوپہر ہو گئی تھی ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ کر گھر آئے۔ کھانا کھایا۔ شام کو میں

نے اپنے دوست کے اعزاز میں پندرہ بیس عمائدینِ شہر کی دعوت کی تھی۔ اس کے متعلق ایک ملازم کو کچھ ہدایات دینا چاہتا تھا کہ دوسرا ملازم ایک تعارفی کارڈ لے کر آیا "پروفیسر سینڈو موریتی ایکس، وائی، زیڈ، اے، بی، سی، ایم، این، او" یا اللہ یہ کیا مصیبت ہے، معلوم ہوتا ہے پھر سے الجبرا پڑھنا پڑ گیا، بہرحال سینڈو موریتی کو اندر بلا لیا۔ موٹا تازہ کسرتی جسم جس پر ڈگریوں نے بجائے نقاہت کے چربی اور بجائے زردی کے سرخی چڑھا دی تھی، رسمی گفتگو کے بعد میں نے تشریف آوری کا سبب پوچھا ارشاد فرمایا "ہم لوگ نے سنا۔ آپ بڑا کھانا دیا۔ ہم تاش کا کھیل لاجواب دکھاتا، چار سوت موٹی زنجیر توڑتا، تیرہ من کا پتھر چھاتی پر رکھتا، ہمارا فیس پچیس ۲۵ روپیہ، آپ کا دوست کھانے بعد کھیل دیکھے گا، بہت خوش ہو گا۔ ہم سرکس کا کھیل بھی جانتا۔ اس کا فیس پچاس روپیہ لیتا"

اپنے دوست پروفیسر ڈاکٹر ہیچمدان کو رات کے گیارہ بجے کی گاڑی سے سوار کر کے میں اسٹیشن سے گھر واپس آیا۔ سونے کے لئے لیٹا، نیند نے آنے کی قسم کھالی تھی، بھلا اس شخص کے پاس نیند آتی بھی کیونکہ جس کو ایک ہی دن میں ایک چھوڑ تین تین پروفیسروں سے پالا پڑا تھا، طرح طرح کے خیالات میرے دل میں چکر لگا رہے تھے، میں نے کہا، یا اللہ اس پروفیسر کے لفظ میں کونسی عظمت ہے جو ہر شخص اس کا شیدائی ہے، نجومی پروفیسر، مداری پروفیسر، تو پروفیسر، میں پروفیسر، اور پروفیسر تو

ہے ہی پروفیسر۔

کسی شخص کا مقولہ ہے، ہم جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ کرتے ہیں، اور جو کچھ نہیں کر سکتے، وہ پڑھاتے ہیں۔ مثلاً میں کچھ کر سکتا تھا، میں نے تجارت شروع کر دی، میرے دوست پروفیسر ہمیدان کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے پروفیسری اختیار کر لی، لیکن یہ بالکل غلط ہے، پروفیسر ہمیدان نے تو ایک عمر تحصیل علم میں صرف کی ہے، آپ فرمائینگے۔ وہ ایک ایک کلاس میں کئی کئی سال رہے ہے، اس لئے عمر صرف ہو گئی۔ لیکن غور کیجئے۔ علم میں پختگی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے، اسی طرح کہ آپ ایک بار، دو بار، دس بار ایک ہی چیز کو دہرائیں رع بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے"

اب رہا علم کا سوال۔ تو علم کو ہم لوگ پرکھ ہی کیسے سکتے ہیں مشکل مضمون مشکل کتابیں دقیق مسائل، ہر ایک کے بس کی بات نہیں، کبھی طلباء کو شکایت ہوتی ہے کہ پروفیسر صاحب نے یہ بات نہیں سمجھائی وہ مسئلہ حل نہیں کیا۔ ایسے موقع پر عموماً پروفیسر کا قصور نہیں ہوتا، بلکہ یہ طلباء کی سمجھ میں آنے کی باتیں ہی نہیں ہوتیں، میرے ایک استاد تھے، خدا بخشے، فلسفہ پڑھایا کرتے تھے، درمیانہ قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ، بڑی بڑی حیران سی آنکھیں، خوش آئند چہرہ، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، لمبے لمبے بال، برش اور کنگھے کی مدد سے پیچھے کو پڑے ہوئے، لیکن جمے ہوئے نہیں بلکہ

ایک ارادی بے پروائی سے کچھ بے ترتیب، یعنی شکل وصورت اور وضع قطع سے بالکل اٹھارویں صدی کے یورپین فلسفی، لیکن درحقیقت علم فلسفہ سے قطعی محروم اور معصوم، ٹھیک اتنے ہی جتنا ایک نوزائیدہ بچہ، گویا یہ صاحب ہمیں فلسفہ پڑھاتے تھے، یعنی اپنے کیمبرج کے لکھے ہوئے نوٹ ہمیں لکھوا دیتے۔ کبھی کبھی سترھویں یا اٹھارھویں صدی کی لکھی ہوئی کسی غیر معروف کتاب سے کچھ نقل کر لاتے، اور وہ ہمیں اس طرح سناتے جیسے آپ کے طبعزاد خیالات ہیں، لیکن لڑکے بھی بلا کے ہوتے ہیں خوب جانتے ہیں کہ

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

ایک نگاہ میں بھانپ لیتے ہیں کہ پروفیسر صاحب کتنے پانی میں ہیں۔ ایک دن نظر بچا کر پروفیسر صاحب کے کیمبرج والے نوٹ غائب کر دیئے۔ اور سمجھ گئے کہ میدان مار لیا، اب ہمارا فلسفی کھیت رہے گا، لیکن جناب جائے استاد خالی، اگرچہ میرا شیر فلسفہ سے قطعاً بے بہرہ تھا۔ لیکن ہزار روپیہ تنخواہ پاتا تھا۔ اس نے بھی وار کیا، یعنی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی۔ ایک ماہر ڈاکٹر سے مشورہ کرنے دہلی چلے گئے، وہاں اپنے ایک ہم عصر دوست سے کیمبرج والے نوٹ لے آئے، جس دن کالج میں پڑھانے آئے۔ جہاں پچھلا سبق چھوڑا تھا۔ بے لاگ وہیں سے پھر شروع کر دیا۔

ایسے کامیاب پروفیسروں کے علاوہ پروفیسروں کے اور بھی اقسام ہیں۔

مثلاً ایک صاحب پروفیسر تھے، اور محض اس لئے کہ اتفاقات نے انہیں پروفیسر بنا دیا تھا۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ ان حضرت نے بار بار پولیس کی نوکری کے لئے ہاتھ پاؤں مارے، لیکن قدرت کی ستم ظریفی نے پولیس کو ان سے محروم رکھا۔ بہرحال اب پروفیسر صاحب کو اپنی لیاقت کے اعلان کا فکر ہوا۔ چند مشکل مشکل مسائل اور موٹی موٹی دس پانچ کتابیں ان کی زبان کی نوک اور بغل کے نیچے دبی رہتی تھیں۔ مگر جب کلاس میں لب کشائی فرماتے تو ہم لوگ منہ کھولے رہ جاتے، ایک تو زبان اجنبی دوسرے مضمون مشکل، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پروفیسر صاحب کسی ایسے خواب کو بیان فرمانا چاہتے ہیں جو انہوں نے خواب میں دیکھا تھا۔

سنا ہے اگرچہ راوی ضعیف ہے۔ ایک جگہ کوئی پوربیا سائیس فن سائیسی کی مشکلات بیان کر رہا تھا۔ اپنے بیان کو ختم کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "بھیا سائیسی علم دریاؤ ہے۔ ۲۶ تسموں اور ۳۲ بکسوؤں کا کھیال رکھنا پڑتا ہے۔ یاکا تسمہ واہیں، واکا تسمہ یاہیں لگ جاتا ہے"۔ پروفیسر صاحب وہاں سے گزر رہے تھے، گزر تو گئے لیکن سنا ہے زیر لب یہ شعر گنگنانے لگے :-

مشکلیں میری تو سن، مشکل سائیس نہ سن
بکسوئے کیا ہیں، جہاں لونڈوں سے دو چار ہوئے

ایک لطیفہ اور سن لیجئے، لوگ اسے لطیفہ کہتے ہیں۔ لیکن میرے ایک پروفیسر اسے سن کر زار زار رونے لگے تھے،

نیشاپور کے مدرسے میں عمر خیام ریاضی اور فلسفے کے پروفیسر تھے۔ ایک دن مدرسے کے صحن میں بیٹھے درس دے رہے تھے، مدرسے میں کچھ تعمیر بھی ہو رہی تھی، اینٹوں سے لدے ہوئے گدھے آجا رہے تھے، سب گدھے دروازے میں سے گزر گئے لیکن ایک بلند بالا خوش رنگ مگر نحیف گدھا دروازے میں اڑ گیا، کمہار ٹٹکارتا ہے۔ ہانکتا ہے، للکارتا ہے، مارتا ہے، مگر گدھا ایک قدم آگے نہیں اٹھاتا، آخر کار کمہار نے سونٹوں کی بوچھار شروع کر دی، مگر یہ حضرت پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے، خیام بھی بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک شاگرد سے کہا۔ میاں جاؤ اور اس گدھے کے کان میں کہہ دو کہ حضرت ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے، آپ تشریف لے جائیں۔ شاگرد نے اس حکم کی تعمیل کی، وہ گدھا جسے کمہار کے ڈنڈے نہ چلا سکے تھے قدم اٹھاتا، بلکہ قدم بڑھاتا ہوا چل دیا۔

تمام طالب علم حیران رہ گئے۔ لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ دست بستہ پروفیسر خیام سے عرض کیا کہ قبلہ اس میں کیا راز تھا۔ پروفیسر خیام نے جواب دیا

"یہ صاحب پہلے یہاں پروفیسر تھے، مرنے کے بعد انہوں نے یہ روپ دھارا ہے۔ جب یہاں پہنچے تو اس خیال سے رُک گئے کہ دیکھیں انہیں کوئی پہچانتا بھی ہے یا نہیں۔ میں ان کا ہم عصر ہوں۔ اس لئے میں نے انہیں پہچان لیا۔"
غور کیجیے پہلے زمانے میں ایسے ایسے پروفیسر ہؤا کرتے تھے، ایک آج کل کے پروفیسر ہیں کہ ہم انہیں روز پہچانتے ہیں +

ایڈیٹر

ایڈیٹر

آثار قدیمہ کی پڑتال اور تواریخ کے مطالعہ سے یہ بات یقین کے ساتھ معلوم ہو چکی ہے کہ بے شمار پیشوں کی ابتدا نوح سے پہلے ہو چکی تھی، وہ پیشے جن کی ابتدا طوفانِ نوح سے پہلے ہوئی تھی نہایت مقتدر سمجھے جاتے تھے، کوئی دس سال کی بات ہے ایک فاضل تاریخ دان نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے کسی یورپین یونیورسٹی میں ایک نہایت بصیرت افروز مضمون پیش کیا۔ اس مضمون میں مؤرخ ممدوح نے نوح کی کشتی کے مسافروں کی ایک طویل فہرست تحریر کی تھی۔ ان کی تحقیقات کے بموجب اس کشتی میں کبوتر، چھپکلی، طوطا، مینا۔ بکری، گدھا، غرضیکہ دنیا کے ہر چرند پرند کا ایک ایک جوڑا موجود تھا۔ اور نہ صرف چرند و پرند کے جوڑے بلکہ مختلف پیشہ وروں کے جوڑے بھی موجود تھے۔

ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ملّا پنڈت اور پادری کے دو دو جوڑے تھے، تعجب کی بات ہے کہ اس طول طویل فہرست میں اسی قبیل کے ایک اور جوڑے کا نام نظر نہیں آتا۔ یعنی نہ ایڈیٹر کا نام ہے نہ ایڈیٹرنی کا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کا پیشہ

طوفانِ نوح کے بعد وجود میں آیا۔ باوجود ہزار کوششوں کے ہمیں اب تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ایڈیٹری کے پیشے کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ قیاس کہتا ہے اس مبارک اور شریف پیشے کا اختیار کرنے والا زندگی کے تمام بھیدوں سے واقف تھا۔ زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے۔ کہ انسان کی جان خطرے میں نہ پڑنے پائے اور ممکن سے ممکن فروغ حاصل ہو جائے۔ غور کیجے ایک مزدور صبح سے شام تک کام کرتا ہے۔ جب کہیں جا کر آٹھ آنے کے پیسے کماتا ہے۔ اس کے برعکس ایک انجینئر صرف کام کرنے کے طریقے بتاتا ہے لیکن سینکڑوں روپے تنخواہ پاتا ہے، یعنی کامیاب زندگی بسر کرنے کا اصلی گر یہ ہے کہ خود کام کرنے کے بجائے انسان میں کام بتانے کی قابلیت ہونی چاہئے۔ اسی اصول پر ایڈیٹر اپنے اخبار کے ذریعے تمام ملک اور قوم کو کام کرنے کے طریقے بتاتا ہے اور حتی المقدور اپنے آپ کو خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

کہتے ہیں کسی گھر میں چوری ہوگئی۔ چوری ہو جانے کے بعد اس واقع پر خوب چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اس گھر کا ایک بہادر آدمی جو پڑا پڑا چور کو چوری کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ بول اٹھا کہ اگر میں جاگ رہا ہوتا تو چور کو چٹکی سے مسل ڈالتا، گویا یوں سمجھئے کہ کچھ نہ کرسکنے کے جرم کو سب کچھ کہنے کی قابلیت سے چھپا لیا گیا، درحقیقت یہ شخص ایک کامیاب ایڈیٹر بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا تھا۔

دوسری مثال سنئے۔ ایک دفعہ ایک صاحب مع اپنے بیوی بچوں کے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، مکان کچا تھا اور برسات کا موسم، اتفاقاً ایک سانپ نکل آیا۔ بیوی اور بچوں میں آپا دھاپی اور افراتفری پڑ گئی، یہ صاحب کھڑے ہو کر پکارنے لگے ارے جلدی کسی مرد کو بلانا۔ سانپ یہ ہنگامہ دیکھ کر جھٹ اپنے بل میں گھس گیا۔ بیوی نے کہا۔ میاں آخر تم بھی تو مرد ہو۔ یہ سورما بولے۔ بیوی تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ بتائی۔ ورنہ سانپ کو یوں بچ نکلنے کا موقع ہرگز نہ ملتا۔

اس قسم کے لوگ کام کرنے کی قدرت نہیں رکھتے البتہ وقت گزر جانے کے بعد بسیار گوئی سے اپنی بہادری کا اعلان کرتے ہیں تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، کہ ایسے لوگ ہی نہایت کامیاب ایڈیٹر بن سکتے ہیں۔

دہلی میں فصیل کے باہر۔ دریا کے کنارے "شاہ بڑے" کا تکیہ بہت مشہور ہے۔ آج کل وہاں چرس اور مدک کے دم لگتے ہیں۔ لیکن اٹھارویں صدی میں صرف ٹھنڈائی چھنا کرتی تھی اور اکثر ایڈیٹر وہاں جمع ہوا کرتے تھے، محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ تھا، نادر شاہ حرص کی آنکھیں پھاڑے اور ہوس کے ہاتھ بڑھائے یلغاریں مارتا دہلی آ پہنچا۔ بادشاہی فوج نے اینٹ کا جواب اینٹ اور پتھر کا جواب پتھر سے دینے کے بدلے "موئے مردوڈ یہاں مت آئیو۔ یہاں زنانے بستے ہیں" کی تان لگائی۔ اور نادر شاہ کو سونا روپیہ دے کر

شیشے میں اتار لیا۔ محمد شاہ اور نادر شاہ میں صلح صفائی ہو گئی۔ شہر میں گھر گھر گھی کے چراغ جل گئے۔ جشن منائے گئے۔ ادھر ایڈیٹر لوگ بھی "شاہ بڑے" پر ٹھنڈائی اڑانے پہنچ گئے دو دو قدحے ٹھنڈائی کے اڑائے۔ اسرور کو دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے دوبالا کر دیا۔ عالم سرور میں ایک بے بہرے ایڈیٹر صاحب یوں گویا ہوئے "میاں اللہ نے آئی بلا ٹالی ورنہ نہ جانے کیا ہوتا" دوسرے صاحب نے کہا "ارے بھائی جب تک یہ مغلہ شہر میں ہے اس وقت تک کیا معلوم اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے" تیسرے صاحب بولے "واہ بھئی واہ، بڑے بے خبرے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں۔ جہاں پناہ نے چھمیاں جان قلماقنی کو بھیج کر مغلے کو مروا بھی ڈالا۔"

بس صاحب! یہ بات دم کے دم میں شہر بھر میں پھیل گئی۔ شہریوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بے چاری نادر شاہی فوج کو مکھی مچھر کی طرح مارنا شروع کر دیا۔ دہلی میں جیسا کچھ قتل و غارت ہوا اس کا حال آپ کو معلوم ہی ہے۔ یہ ایڈیٹر صاحب کا ادنےٰ کرشمہ تھا۔

لطف یہ ہے کہ محمد شاہ رنگیلے کے زمانے کی یہ خاصیت ایڈیٹروں میں آج بھی موجود ہے۔ آپ سوچتے ہونگے کہ آخر ایڈیٹری کے مرض کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ مجھے بھی معلوم نہیں کہ اور ایڈیٹر صاحبان کو یہ مرض کیونکر لاحق ہوا۔ البتہ مجھے اپنے متعلق تمام واقعات یاد ہیں۔

مچھر ہمیں کاٹ لیتا ہے لیکن ایک ہی مچھر کے کاٹنے سے فوراً ملیریا نہیں ہو جاتا۔ مختلف موقعوں پر مچھر کاٹتے رہتے ہیں آخر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ملیریا کے جراثیم آ دباتے ہیں

میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ایڈیٹر کی ابتدا بھی طرح طرح کے مچھروں کے کاٹنے سے ہوتی ہے۔ مثلاً ادیب کہلانے کا مچھر کاٹ لیتا ہے اور پھر وقتاً فوقتاً کاٹتا رہتا ہے۔ قوم کی تباہ حالی پر آنسو بہانے کا مچھر کاٹ لیتا ہے اور کاٹتا رہتا ہے۔ چندہ جمع کرنے کا مچھر کاٹ لیتا ہے۔ بلکہ بہت کاٹ لیتا ہے! اور پھر کاٹتا رہتا ہے۔ قومی مرغ لڑانے کا مچھر کاٹ لیتا ہے اور کاٹتا رہتا ہے۔ مذہبی جوش کا مچھر کاٹ لیتا ہے اور کاٹتا رہتا ہے۔ گویا ان طرح طرح کے مچھروں کے مسلسل کاٹتے رہنے سے انسان کو ایڈیٹری کا بخار چڑھ جاتا ہے۔ ایڈیٹر بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ ہر ایڈیٹر کا نصب العین اگرچہ ایک ہی ہوتا ہے لیکن میدانِ عمل مختلف، مثلاً ادبی، تنقیدی، روحانی رسالوں کے ایڈیٹر کے لئے ضروری ہے کہ اسے عشق کا مچھر بھی کاٹے، بہرحال یہ مضمون بہت وسیع ہے جیسے قابل طبیب اور ماہر ڈاکٹر کئی سال تک امراض کی تشخیص پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں پڑھتے رہتے ہیں اور پھر سالہا سال کے تجربوں کے بعد امراض کی تشخیص پر قادر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایڈیٹری کے مرض کی تشخیص کے قابل ہونے میں بھی ایک مدتِ مدید گزر جاتی ہے۔

ہاں اوروں کا قصہ چھوڑیئے میں آپ بیتی سناتا ہوں۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ سات دن پہلے گھر میں سفیدی ہو چکی تھی، اور اسی روز دھوبن کپڑے بھی دے کر گئی تھی، گویا خلافِ معمول کمرہ بالکل صاف تھا۔ پلنگ

کی چادر۔ تکئیے کے غلاف اور میرے کپڑے بھی بالکل اجلے تھے۔ مجھے بچپن سے عادت ہے کہ سفید دیواریں دیکھ کر ان پر کوئلے سے لکھنے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہوں۔ کوشش بھی کرتا ہوں کہ یہ عادت چھوٹ جائے۔ لیکن کامیاب نہیں ہوتا۔ اس وقت مجھ پر یہی جذبہ پھر طاری ہوا۔ جی چاہتا تھا کہ سفید چھت پر پنسل سے کچھ لکھنا شروع کر دوں لیکن اتنی بڑی پنسل کہاں سے آتی۔ میں نے سوچا ایک آٹھ دس فٹ لمبے بانس میں ایک سفیدی کرنے کی کوچی باندھ لوں اور سفیدی کی ناند میں سیاہی گھول کر سفید براق چھت پر گلکاریاں کرنی شروع کر دوں۔ بس جناب تخیل میں یہ سب سامان مہیا کیا اور چھت پر لکھنا شروع کر دیا۔ ابھی ایک آدھ حرف ہی لکھا تھا کہ چادر، تکئیے، اور میرے کپڑے سیاہی کے دھبوں سے خراب ہو گئے، بدحواس ہو کر چونک پڑا۔ خیال کا طلسم ٹوٹ گیا۔ بہر حال اس تمام واقعے سے ایک بات مجھ پر واضح ہو گئی اور وہ یہ تھی کہ اگر لکھنے کا مزہ مجھے آئے اور سیاہی کی چھینٹیں اوروں پر پڑیں تو بڑا لطف رہے۔ لیکن یہ لطف کیونکر حاصل ہو۔ سوچتے سوچتے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اگر اخبار نویسی شروع کر دوں تو البتہ دوسرے لوگوں کے صاف ستھرے کپڑوں پر سیاہی کی چھینٹیں دل کھول کر ڈال سکتا ہوں۔ بس اسی دن سے میں نے ایڈیٹری شروع کر دی۔

کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ میری سرشت بچھو کی سی ہے اور میرا مقصد اوروں کو دکھ پہنچانا

ہے۔ نہیں نہیں۔ یہ ایڈیٹری ابتدا میں صرف تفریح کا باعث تھی، چونکہ ہر شخص اپنے لباس کو حتی الامکان صاف رکھنا چاہتا ہے اس لئے وہ مجھے چھینٹیں اڑانے سے باز رکھنے کے لئے تھوڑی سی مدد دے دیا کرتا تھا۔ گویا اس ایڈیٹری کے طفیل ہم ع

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی

قصّہ مختصر اس طرح سے میں ایڈیٹر بنا۔ اور میرا خیال ہے اکثر ایڈیٹر اسی طرح کسی چھوٹے سے واقعے کے زیر اثر ایڈیٹر بن جاتے ہیں۔ شاید آپ یہ سمجھتے ہونگے کہ ایڈیٹر کا کام بہت آسان ہے۔ اس بے چارے کی جان کو تو ہزاروں ہی دکھ لگے رہتے ہیں۔ مثلاً کہیں شادی ہے کہیں ولیمہ کی دعوت ہے۔ ایڈیٹر صاحب کو دعوتی رقعے برابر پہنچتے رہتے ہیں۔ مانا کہ انہیں اچھے اچھے کھانوں کی خواہش نہیں لیکن کسی کی خوشی میں شامل نہ ہونا ایڈیٹر کے اصول کے خلاف ہے، اس لئے بے چارہ ایڈیٹر کچھ نہیں تو دعوت ولیمہ میں ضرور شریک ہو جاتا ہے، خوشی اور رنج آئے دن کی باتیں ہیں۔ چونکہ ایڈیٹر شہر کے ممتاز آدمیوں میں شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا اس بے چارے کو ہر تقریب میں جانا ضرور ہے۔ سچ پوچھئے تو لیڈر بننے کے تمام طریقوں میں ایک نہایت مفید طریقہ دعوتوں میں شریک ہونا ہے، اس طرح سے رفتہ رفتہ ایڈیٹر لیڈر بھی بن جاتا ہے۔

ایڈیٹر سے لیڈر بننے والی قسم اتنی ضرر رساں نہیں ہوتی جتنی لیڈر سے ایڈیٹر

بننے والی قسم لیڈر کے لئے ضروری ہے کہ وہ لیڈر رہنا رہے اور اگرچہ ہر ایڈیٹر کے لئے لیڈر بننا آسان اور ضروری نہیں لیکن ہر لیڈر کے لئے ایڈیٹر بننا ضروری ہے۔ یہ عجیب واقعہ ہے کہ تمام آدمی ان لوگوں کی زیادہ قدر کرتے ہیں جو انہیں ہر وقت برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ لیڈر بھی اس راز کو خوب سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایڈیٹر بن جاتے ہیں۔

آپ نے اکثر اخباروں میں پڑھا ہوگا "ہمارے اخبار میں اشتہار دینا کامیابی کی دلیل ہے" یہ چھوٹا سا جملہ نہایت پر معنی ہے۔ کیونکہ اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اشتہار دینا کس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اشتہار دینے والے کی یا ایڈیٹر کی؟

اشتہارات بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ پنجاب کے اشتہارات سے پنجاب کے رہنے والوں کی جسمانی صحت کا پتہ چلتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اکثر اشتہاروں کے متعلق ایڈیٹر صاحب دواؤں کے آزمودہ ہونے کا سارٹیفکیٹ بھی دے دیتے ہیں۔ اللہ ایڈیٹروں کی نسل پر اپنا خاص رحم فرمائے۔

زنانہ ایڈیٹروں کے متعلق میں کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں، کہ میں ایڈیٹروں سے ڈرتا ہوں، وہ تو میری برادری کے لوگ ہیں۔ بلکہ میں خواتین سے ڈرتا ہوں، مجھ میں ان کے اخباروں اور ایڈیٹروں کے متعلق کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں۔ البتہ یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شادی کی ضرورت کے اشتہارات ضرور پڑھ لیا کیجئے۔ ہمارا

ملک بھی کیسا اچھا ملک ہے جہاں ہر دلہن کی عمر بارہ اور چودہ برس کے درمیان ہوتی ہے اور ہر دولہا کی عمر انیس بیس کے لگ بھگ۔ دونوں شکل وصورت میں چندے آفتاب اور چندے ماہتاب، علم وعقل میں افلاطون، عادت وسیرت میں فرشتہ، مال ودولت میں قارون، یہ سب کچھ اشتہار دینے والی کی صفات نہیں بلکہ ایڈیٹر صاحب کی لیاقت کی نشانیاں ہیں، ہاں تو اب ایک فلسفیانہ نکتہ سن لیجئے، کسی نے پوچھا کہ بد گو بدگوئی کب چھوڑیں گے جواب ملا، جب برائی سننے والے برائی سننا چھوڑ دیں گے، پھر ایڈیٹر بے چارے کا کیا قصور ہے، آپ اپنے دل میں کہتے ہونگے، کہ یہ مسخرہ اپنے آپ سے بیزار ہے، اپنے مقدر پیشے کو بہت برا بھلا کہہ چکا ہے، شاید یہ کسر نفسی کا نتیجہ ہے، حضرت اسے کسر نفسی نہ سمجھئے ہیں میں ایک اور ایڈیٹر کا اسی قسم کا مقولہ آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔

یہ ایڈیٹر صاحب دہلی میں رہتے تھے، آپ کا اسم گرامی تھا۔ اسداللہ خاں صاحب غدر کے آس پاس کی دلّی کے چشم وچراغ اور نفس ناطقہ تھے، فرماتے ہیں ؎

اور میں وہ ہوں اگر جی میں کبھی غور کروں

غیر کیا خود مجھے نفرت میری اوقات سے ہے

اب میں کسر نفسی کو بالائے طاق رکھتا ہوں اور اپنے پیشہ کی کچھ مشکلات عرض کرتا ہوں۔

دیکھئے صاحب! آپ بازار تشریف لے جاتے ہیں۔ چند رومال اور بنیان خریدنا چاہتے ہیں۔ دو تین دکانوں پر یہ چیزیں دیکھتے ہیں۔ لیکن پسند نہیں آتیں، آخر کار ایک دکان پر سب چیزیں حسب منشاء پاتے ہیں۔ اور خرید لیتے ہیں۔ اگر گھر تشریف لانے کے بعد آپ غور فرمائیں تو آپ کو یاد آجائے گا کہ پہلی دکان پر جو موزے آپ نے ملاحظہ فرمائے تھے۔ وہ اتنے ہی اچھے تھے جیسے آپ نے خریدے ہیں اور قیمت میں بھی کچھ کم تھے، اسی طرح بنیان اور رومال وغیرہ وغیرہ، بلکہ سب چیزیں مختلف دکانوں پر اتنی ہی اچھی تھیں جیسی آپ خرید کر لائے ہیں، آخر آپ نے اتنی دکانیں کیوں دیکھیں اور جب چیزیں خریدیں تو کسی قدر گراں خریدیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ آخری دکاندار اپنی چیزیں دکھاتا جاتا تھا اور برابر تعریفیں کرتا جاتا تھا نفسیات کا ماہر ہونے کی وجہ سے وہ ان چیزوں کے صرف وہی اوصاف بیان کرتا تھا جو آپ سننا چاہتے تھے، ایڈیٹر بھی اسی اصول پر کاربند ہوتا ہے، وہ یہ نہیں بتاتا کہ آج دنیا کا درحقیقت حال کیا ہے بلکہ وہ دنیا کے متعلق ایسی باتیں بیان کرتا ہے جو آپ سننا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کام آسان نہیں۔ اس میں بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ ایک تاجر کامیاب ہوتا ہے۔ دوسرا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک اخبار کامیاب ہوتا ہے اور دوسرے کے صرف نمونے کے پرچے جاتے ہیں، ہر روز نت نیا افسانہ اور نئی سے نئی بات سنانا آسان کام نہیں، یہ ایڈیٹر ہی کا دل و دماغ بلکہ جگرا ہے کہ وہ نئی سے نئی کھلتا ہے یعنی ع

ہر لحظہ بشکلِ دگر آں یار بر آمد

ایک مثال اور سُن لیجئے اخبار میں درج ہوتا ہے کہ موضع جمال پور میں ایک چرواہے کے ہاں دو جڑواں بچے پیدا ہوئے، ان میں سے ایک بچے کی شکل بکرے کی سی تھی اور دوسرے کی نیولے جیسی، یہ دونوں بچے زندہ ہیں۔ دوسرے دن کے اخبار میں نیولے کی سی شکل والے بچے کی وفات حسرتِ آیات کا ذکر ہوتا ہے، اور تیسرے دن کے پرچے میں میاں بکرے کا مَیں مَیں کرتے ہوئے اس جہانِ فانی سے رحلت کا حال۔

آپ کیا سمجھے، واقعہ سنایا ایسا کہ آپ کے کان کھڑے ہو گئے، کان کیا جسم کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو گیا۔ بلکہ تمام جسم کانپنے لگا، بالکل ممکن ہے کہ آپ تحقیق پر تل جائیں۔ اس لئے جلد از جلد دونوں بچوں کا قصہ تمام کیا۔ اب بتلائیے یہ کام مشکل ہے یا آسان؟

لوگ کہتے ہیں کہ یورپ کی جنگ عظیم اخباروں نے شروع کرائی، اور جب لاکھوں انسان فنا ہو گئے۔ شہر اجڑ گئے، بستیاں ویران ہو گئیں اور اس لئے اخباروں کی اشاعت کم ہو گئی تو پھر ایڈیٹروں نے صلح صفائی کرا دی، اب فرمائیے کیا ایڈیٹر ہونا کچھ آسان کام ہے؟

کہتے ہیں ایک بار انسان اور شیطان میں بات چیت ہو رہی تھی! انسان شیطان پر الزام لگا رہا تھا کہ دنیا میں جھگڑے فساد کی جڑ تو ہے۔ شیطان کہہ رہا تھا۔ میاں حرکتیں تو تم سے سرزد ہوتی ہیں اور قصور وار میرا بناتے ہو۔ دونوں کھڑے ہو گئے، ایک حلوائی کی دکان

سے سودا خریدا، شیطان نے شیرے کی انگلی دیوار پر لگا دی، دو چار مکھیاں فوراً اس شیرے پر آ بیٹھیں، ایک چھپکلی لپکی کہ ان کو اپنا لقمہ بنائے، انسان کی گود میں بلی تھی، وہ چھپکلی پر حملہ آور ہوئی، حلوائی نے گھبرا کر چونری کو جنبش دی، اس حرکت سے بلی سہم گئی اور دودھ کے کڑھاؤ میں آ گری، اس بات پر بڑی تُو تُو میں میں ہوئی۔ اور نوبت ہاتھا پائی پر آ گئی۔ جب انسان اور شیطان وہاں سے آگے چلے تو شیطان نے پوچھا، بھائی انسان ذرا بتاؤ تم لوگ آپس میں لڑتے رہے یا نہیں۔ اور میں معصوم بنا الگ کھڑا رہا یا نہیں؟ انسان بے چارہ سادہ لوح ہوتا ہے۔ اس وقت قائل ہو گیا۔ لیکن اسے پھر یاد آیا کہ دیوار پر شیرے کی انگلی تو شیطان ہی نے لگائی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔ ارے بھئی وہ شیرے کی انگلی کس نے لگائی تھی؟ یہ سنتے ہی شیطان غائب ہو گیا۔

شادی خانہ آبادی

شادی خانہ آبادی

چند روز کی بات ہے ایک دن دوپہر کے وقت میں ایسی چین کی نیند سو رہا تھا جو صرف کنواروں ہی کو نصیب ہوا کرتی ہے۔ اس مزے کی نیند میں مَیں نے ایک خواب دیکھا۔ اگرچہ ایک ہفتہ ہو چکا ہے لیکن اس خواب کا خیال دل سے نہیں مٹتا۔ لوگ کہتے ہیں۔ ہر خواب کی تعبیر ہوتی ہے اور وہ پوری ہو کر رہتی ہے، اللہ کرے میرے خواب کی تعبیر جتنی ظہور میں آ چکی ہے اس سے زیادہ پوری نہ ہو۔

آپ بھی میرا خواب سننا چاہتے ہیں۔ مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں "آپ سنیے گا تو ڈر جائیے گا"۔ بہر حال سنیے اور ضرور سنیے۔

کیا دیکھتا ہوں، ایک لق و دق میدان ہے اس کے بیچوں بیچ ایک بہت وسیع باغ ہے جس میں صاف اور ٹھنڈے پانی کی خوبصورت نہریں بہہ رہی ہیں۔ لاکھوں درخت ہیں۔ جو رنگ رنگ کے پھلوں سے لدے کھڑے ہیں۔ کوئی پھل کھائیے تو زبان کو وہ ذائقہ اور دماغ کو وہ فرحت نصیب ہو کہ دنیا کے تمام غم دُور ہو جائیں۔ کسی پھول کو سونگھئے، تو

روح اس کی دل موہنے والی خوشبو سے رقصِ بسمل کرنے لگے، طرح طرح کے پیارے پیارے رنگوں والے اور بے انتہا میٹھی بولیاں بولنے والے پرندے درختوں کی نازک ٹہنیوں پر بیٹھے چہچہا رہے ہیں۔

باغ کی روشوں پر بڑی رونق اور چہل پہل ہے، ایک سے ایک بانکا اور سجیلا جوان محوِ گلگشت ہے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی جنت کا ٹکڑا ہے۔ ادھر دل کی آرزو زبان پر آئی اور ادھر پوری ہوئی۔ کسی پھل کی خواہش کیجئے تو جھولی پھلوں سے بھر جائے پھول کی تمنا کیجئے تو پھولوں کی بارش شروع ہو جائے، کسی پرند کی خوش الحانی کی داد دیجئے تو فوراً وہ آپ کے ہاتھ پر آبیٹھے گا، اور آپ کے دل کو اپنے دل کُشا نغموں سے مست کر دیگا۔ باغ کے عین بیچ میں ایک سنگ مرمر کا حوض ہے۔ اس میں ایک نورانی صورت بزرگ جلوہ افروز ہیں۔ وہ آپ کی ہر ایک دلی مراد پوری کرتے ہیں اور پھر فوراً ہی اس باغ سے رخصت ہو جانے کا اشارہ کرتے ہیں۔ اکثر نوجوان اس باغ سے جانا نہیں چاہتے۔ اس پر وہ بزرگ فرماتے ہیں جاؤ ایک اور باغ بھی ہے، یہاں سے تحفہ مل جانے کے بعد اس باغ کا رستہ خود بخود مل جاتا ہے، تم اب اس باغ میں بیگانے ہو۔ تمہارا ٹھکانہ وہی باغ ہے۔

میرے دل میں کوئی خواہش نہ تھی، میں صرف اس باغ کی سیر کر رہا تھا۔ یکایک وہ بوڑھا نمودار ہوا۔ اور بولا بیٹا تم یہاں بہت دیر سے پھر رہے ہو۔ اب مناسب یہی ہے کہ تم بھی

رخصت ہو۔ اور کسی کو ایک آدھ تحفہ ملتا ہے تم یہ پھلوں کے ٹوکرے بھی لو، گجرے بھی لو، اور اس من موہنی چڑیا کا پنجرہ بھی لو مجھے یہ سودا کسی عنوان پسند نہ تھا ؎

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے

نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

میرے انکار پر بوڑھا لال پیلا ہو گیا۔ میری پنڈلیوں پہ ایک قمچی رسید کی اور غصے میں کہا جاؤ دور ہو جاؤ۔ قمچی کی تکلیف سے جاگ اٹھا، دیکھتا کیا ہوں کہ میرا خدمت گار پلنگ کے پاس کھڑا کہہ رہا ہے "میاں ایک صاحب پون گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔ میں اٹھ بیٹھا لیکن اس خواب کی خلش دل میں باقی تھی ع

گو عیسیٰ و گو خضر کو تعبیر یہ پرسیم

بہر حال ان صاحب سے ملاقات ہوئی، دورانِ گفتگو میں انہوں نے فرمایا کہ ایک تقریر کر دیجیے، میں تقریر کرنے سے نہیں گھبراتا، لیکن انہوں نے فرمایا کہ ریڈیو پر بولنا ہوگا۔ مجھے اس پہ بھی اعتراض نہ تھا، مزید ارشاد فرمایا کہ تقریر کا موضوع "شادی خانہ آبادی ہوگا"۔ یہ سن کر میں حواس باختہ ہو گیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ یا اللہ! کیا خواب کی تعبیر پوری ہونی شروع ہو گئی۔ انکار کی ہمت نہ تھی۔ اور شادی خانہ آبادی سے تو بہر حال ریڈیو پر تقریر بہتر ہی ہے ع

ہر چہ آید بر سرِ اولادِ آدم بگذرد

میرے بہت سے دوست ہیں اور ان میں تین چوتھائی سے زیادہ شادی شدہ ہیں۔ یہ بزرگ چونکہ خود پھنس چکے ہیں اس لئے ہمیشہ اسی فکر میں رہتے ہیں "جو بھی اس جال میں پھنس جائے اچھا ہے"۔ جب دیکھو انہیں یہی رٹ لگی رہتی ہے "میاں تم بھی عجب انسان ہو، تندرست ہو، اچھی صورت ہے، مجھے اپنی زبان سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن لوگ یہ بھی کہتے ہیں" آسودہ اور خوشحال ہو، کماؤ ہو، اچھی آمدنی ہے۔ پھر تم شادی کیوں نہیں کرتے تمہارے ملازم تمہیں لوٹے کھاتے ہیں۔ روپے کی جگہ پانچ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ گھر میں بیوی آئے گی تو خود بخود سب انتظام ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں مارے مارے پھرتے ہو، میاں گھر میں دل بستگی ہوگی، لطف ہوگا تم نے سنا نہیں:"

"ہر کہ زن ندارد آسایش تن ندارد"

غرضیکہ جتنے شادی شدہ دوست اتنی ہی نصیحتیں، میں ہزار کہتا ہوں کہ بھائی اچھی گزر رہی ہے، اپنی نیند سوتا ہوں، اپنی نیند جاگتا ہوں، آخر بیٹھے بٹھائے یہ بلا کیوں مول لے لوں، لیکن میں جتنا انکار کرتا ہوں وہ اتنا ہی اصرار کرتے ہیں۔ آخر پیچھا چھڑانے کے لئے کہہ دیتا ہوں، ارادہ کر رہا ہوں۔ دیکھو یہ بھی ہو جائے گا۔ لیکن یہ کتنا غضب ہو جاتا ہے۔ اسی وقت رشتے تجویز ہونے لگتے ہیں۔ ایک کہتا ہے وہ جو ڈپٹی صاحب ہیں، ان کی لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے، سنا ہے ماشاء اللہ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہے، گھر کی

پڑھی لکھی ہے، پھر باپ کے چار پیسے بھی ہیں۔ البتہ پردے کی پابندی سخت ہے، ڈپٹی صاحب ذرا شرع شریعت کے پابند ہیں۔ دوسرے دوست بے ساختہ بول اٹھتے ہیں۔ میاں پردہ وردہ ان کے بس کا روگ نہیں، فلاں ڈاکٹر صاحب کی سب لڑکیاں نئے فیشن کی ہیں۔ گو کسی کالج میں نہیں پڑھیں۔ لیکن ایف اے گھر میں پڑھ کر پاس کر لیا ہے۔ تیسرے صاحب فرماتے ہیں۔ اور بھائی وہ کلب میں جو جج صاحب کی صاحبزادی آتی ہے وہ تو واللہ بڑی فیشن ایبل اور نئے خیال کی ہے۔ اور پھر وکالت بھی پاس ہے، غرض کہ مجھ ایک بیچارے کی شادی خانہ آبادی کے لئے پردہ والی عفیفہ سے لے کر کلب اور پاؤڈر والی لڑکیوں تک کا محاسبہ ہو جاتا ہے۔

جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو، تھوڑی دیر کے لئے یہ گفتگو ختم ہو جاتی ہے مگر پھر ایک صاحب از سرِ نو سمجھانا شروع کر دیتے ہیں" دیکھو بھائی شادی ضرور کرو، باپ دادا کا نام چلتا ہے، ورنہ دس بیس برس بعد دنیا بھول جائے گی"۔ میں کہہ دیتا ہوں کہ جناب ہم نے اس دنیا میں کیا تیر مار لیا ہے اور باپ دادا کے نام کو ایسا کونسا روشن کر لیا ہے جو اب آگے کو نام نہ چلے گا تو دنیا کو بہت نقصان پہنچ جائے گا۔ اور اگر نام ہی منظور ہے تو استاد ذوقؔ فرما گئے ہیں ؎

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا　　　پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا،

میرے ایک دوست جن کی عمر پچاس سے اوپر ہے ایک روز فرمانے لگے "میاں جوانی میں تو بیوی کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ بڑھاپے میں بیوی کے بغیر گزارا نہیں"۔ میں نے عرض کیا "صاحب! اگر بوڑھے کی بوڑھی بیوی ہے تو کوئی خاص فائدہ نہیں، اگر جوان بیوی ہے تو سراسر نقصان ہی نقصان ہے"۔

عجب تماشا ہے۔ شادی سے پہلے ہر ایک شادی کی برائی کرتا ہے مگر موقع کا منتظر رہتا ہے۔ گویا داؤں لگتے ہی شادی کر لیتا ہے۔ لیکن شادی ہونے کے بعد ایک حرف شادی کے خلاف نہیں کہتا۔ زیادہ سے زیادہ بیوی کی شکایت سننے میں آتی ہے۔ اور اس میں بھی یہ دلیل نکال لی جاتی ہے کہ ہماری قسمت بری تھی، جو ایسی بیوی ملی۔ ورنہ میر صاحب کیسے خوش ہیں۔ مرزا جی ہر وقت مگن رہتے ہیں۔ یعنی عورتیں بھی آم ہیں، موسم کا میوہ کوئی میٹھا کوئی کھٹا۔ کھٹے آم کو بے تکلف کھٹا کہہ دیتے ہیں۔ لیکن بیوی کے معاملے میں ہونٹ سل جاتے ہیں۔

میں نے ایک دفعہ ایک بھیڑ پالا۔ اس نے جگہ جگہ مینگنیاں کر کے اور اپنی ہر وقت کی بھیں بھیں سے زندگی تلخ کر دی، والد صاحب ایک دن کچھ خفا ہو کر فرمانے لگے:۔

"غم نہ داری بُز بخر"

ہمارے ہاں ایک ایرانی عورت ملازم تھی، اتفاقاً اس وقت میز کے قریب کھڑی تھی

برجستہ بولی،

آغا بز چو خریدی غم مکن

بس جناب جیسے بھیڑ خریدنے کے بعد اس سے تنگ آنا حماقت ہے اسی طرح شادی کے بعد پچھتانا بھی حماقت ہے لیکن نہ پچھتانے کے معنی یہ نہیں کہ آپ فریب ہستی میں مبتلا نہیں۔ مرزا غالب نے شادی کے متعلق ایک جگہ فرمایا ہے ؎

شادی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ

بیوی تمام حلقۂ دام خیال ہے

خطوط بھی ایک نعمت ہوتے ہیں۔ مجھے روز ڈاک کا انتظار رہتا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں تو میں ڈاکیہ کی صورت دیکھ کر سہم جایا کرتا تھا جب دیکھو کسی نہ کسی کی شادی کا دعوتی رقعہ، شادی کا رقعہ دیکھ کر میری ایسی حالت ہوتی تھی۔ جیسے اپنے پالے ہوئے کسی جانور کی خبر مرگ سن کر۔ اللہ کا شکر ہے اب دو ایک مہینے سے یہ دعوتی رقعے کم آنے لگے ہیں اور کم کیوں نہ ہوتے، رفتہ رفتہ میرے بہت سے دوست اس راہ میں کام آچکے ہیں۔

پانچ سال ہوئے۔ میرا ایک نہایت عزیز کتا مر گیا۔ اس دن سے میں نے اس ذات کا کوئی کتا نہیں پالا۔ میں کارلو کی جگہ کسی اور کو کیوں دیتا۔ کوئی تین سال ہوئے میرے عزیز دوست مسٹر حیدر کی شادی ہوگئی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، اس دن سے میں نے کوئی

نئی دوستی پیدا نہیں کی۔ حیدر کو میں بڑے رحم کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ وہ قابل رحم نہ ہونے کا گمان پیدا کرنے کے لئے مسز حیدر کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے۔ کل کہہ رہا تھا، "میں ہمیشہ سے برسات میں ایک چادر اوڑھ کر سویا کرتا تھا۔ اس دفعہ مسز حیدر نے دُلائی بنا دی ہے بہت ہی آرام ملتا ہے"۔ آپ ہی انصاف کیجئے۔ کیا دو چادریں برسات کی گرمی میں آرام کا باعث ہو سکتی ہیں؟ ان باتوں سے میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نظام زندگی کے الٹ پھیر کا نام گویا شادی ہے۔

یہ شادی تو میری سمجھ میں آجاتی ہے مگر خانہ آبادی کا بھید نہیں کھلتا۔ ظاہرا تو یوں شروع ہوتی ہے کہ میاں اچھے اچھے کپڑے پہنتے ہیں، سہرا باندھتے ہیں۔ گھوڑے پر لیکن آج کل موٹر پر سوار ہو کر معصوم سی شکل بنائے کسی بھلے مانس کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں سے ایک اَن دیکھی اور انجان لڑکی کو پالکی میں بٹھا کر اپنے گھر لے آتے ہیں لو صاحب! اَب خانہ آبادی شروع ہو گئی۔ اسی گھر میں ماں بیٹے پر، اور بہنیں بھائی پر جان چھڑکتی تھیں۔ ہر ایک خوش تھا، لیکن اَب چند دن کے چاؤ چونچلوں کے بعد ماں اور بہنوں کی خفگی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک لڑکی جو سگھڑ اور سلیقہ شعار مشہور تھی اب نکمی اور پھوہڑ کہلانے لگتی ہے، گویا خانہ آبادی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ خوشی خفگی سے بدل جائے اور سلیقہ والی بدتمیز کہلائے۔

خانہ آبادی کی دوسری صورت ذرا مختلف ہے، ایک صاحب کسی جگہ ملازم ہیں اور آپ اپنے مختار ہیں شریف لڑکیوں کے لئے بر کا قحط ہے۔ یہ صاحب شریفوں میں شادی کر کے شریفوں میں شمار ہونا چاہتے ہیں ادھر ایک شریف گھرانہ بھی بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ اس لئے چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو جاتا ہے میاں بے باکیاں اور عریانیاں چاہتے ہیں اور بیوی کو بیباک ہوتے ہوتے سال چھ مہینے لگ ہی جاتے ہیں اسی طرح سے پرانی اور نئی روشنی میں رسا کشی شروع ہو جاتی ہے۔ آخر کار کچھ بیوی ہار مانتی ہیں کچھ میاں دب جاتے ہیں۔ اب شام کے وقت مال روڈ پر یہ جوڑا اس طرح خراماں نظر آتا ہے کہ میاں سوٹ پہنے ایک قدم آگے، اور بیوی ایک قدم پیچھے، ساڑھی نئی نئی باندھنی شروع کی ہے اس لئے کمر کے قریب کپڑا اکٹھا ہو کر ایک گپھا سا بن جاتا ہے جیسے کسی مداری کی بندریا لہنگا پہن لیتی ہے۔ ہاں ایک بات اور ہے کہ دونوں بازو لٹکا کر چلنے کے بجائے دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھا کر چلتی ہیں۔ میاں بدمزہ ہیں کہ بیوی کو سیر کا سلیقہ نہیں۔ بیوی چیں بہ جبیں ہیں کہ یہ وردی کا پہننا اور روز پریڈ کرنا عجب مصیبت ہے۔ یہ بھی ایک شادی خانہ آبادی ہے۔

ایک کلب کی شادی خانہ آبادی ہوتی ہے۔ صاحب کی ملاقات مس صاحب سے کلب میں ہو جاتی ہے۔ فریقین ڈورے ڈالنے شروع کرتے ہیں۔ سال ڈیڑھ سال

کی کورٹ شپ کے بعد شادی خانہ آبادی ہو جاتی ہے یعنی بیوی کے حقوق میاں پہ تو ضرور قائم ہو جاتے ہیں لیکن میاں کا گھر اتنا ہی ویران رہتا ہے جتنا پہلے تھا، اور بیوی کی کلب اتنی ہی آباد رہتی ہے جتنی پہلے تھی، اس شادی خانہ آبادی کے معنے یہ ہوئے کہ میاں بیوی شادی شدہ کہلائیں لیکن خانہ آبادی نہ ہو،

غرض ہر شادی کے بعد کسی نہ کسی طرح خانہ آبادی ہو ہی جاتی ہے۔ اور یہ بیل خوب منڈھے چڑھتی ہے، گھر میں شور وغل رہتا ہے، آخر خانہ آبادی کی اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شادی خانہ آبادی بھی ایک فن ہے۔ جس میں کامیابی بغیر انتہائی محنت اور مشقت کے ممکن نہیں۔ دیکھئے ایک صاحب شکل صورت میں بھوت کے بھائی ہیں۔ لیکن ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیوی اگر آسمان کا تارا نہ ہو تو کم از کم کوہ قاف کی پری ضرور ہو۔ ایک صاحب پانچ یا چار مسلسل حملے میٹرک اور ایف اے کے امتحان پر کر کے ناکام رہ چکے ہیں۔ لیکن ان کی کوشش یہی ہو گی کہ ان کی بیوی کم از کم بی۔ اے۔ بی ٹی ضرور ہو۔ گھر پر روٹی پکائے اور سکول میں کلاس پڑھائے۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ میاں کے پاس مونچھیں ہی مونچھیں ہیں۔ بلکہ اب تو مونچھوں کا رواج بھی نہیں رہا۔ لیکن بیوی ایسی چاہتے ہیں جو قارون کے خزانے کی مالک ہو۔ اور حاتم طائی کا دل رکھتی ہو، شادی خانہ آبادی کے سلسلے میں ایسی کوششیں عام ہیں۔ لیکن کسی کو روپے کے تیرہ آنے

دیدیجئے یا جنس کم تولئے تو آپ کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۴۲۰ کے ماتحت سزا کا مستوجب قرار دے دیا جائیگا! البتہ شادی خانہ آبادی کے معاملے میں ہر قسم کی جعل سازی جائز سمجھی جاتی ہے گویا ایک شادی خانہ آبادی کے معنے یہ ہوئے کہ جعل سازی جرم نہیں۔

میں کبھی کبھی سوچا کرتا ہوں کہ بعض من چلے تین تین چار چار شادیاں کیوں کر ڈالتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ایک شادی کی اور خانہ آبادی نہیں ہوئی۔ اس لئے دوسری شادی کرنی پڑی، پھر خانہ آبادی نہیں ہوئی۔ آخر کار تیسری کی وغیرہ وغیرہ

آخر ایک دن یا تو خانہ آبادی ہو گئی یا خانہ آبادی کی خواہش ہی نہ رہی۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایک شادی کی اور خانہ آبادی ہو گئی، چونکہ ایک گھر تھا۔ آباد ہو گیا۔ اس لئے ایک اور گھر بنانے اور آباد کرنے کی سوجھی، اور پھر تیسری شادی کے بعد تیسرا خانہ آباد کرنے کی سوجھی درحقیقت اصلی خانہ آبادی یہی ہے کہ ایک سے زائد بیویاں ہوں اور ان میں خوب لڑائی جھگڑے رہیں۔ گھر میں رونق ہو۔ گھر زیادہ سے زیادہ آباد ہو۔ مرزا غالب علیہ الرحمۃ نے خانہ آبادی کی ان دونوں صورتوں کے متعلق اپنے فلسفیانہ انداز میں خوب فرمایا ہے ؎

خانہ آبادی کا خوگر ہو تو مٹ جاتے ہیں رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

خیر صاحب آپ نے خود ایسی بہت سی شادیاں اور خانہ آبادیاں دیکھی ہونگی۔ اب ع

بوڑھے کی برات آئی ذرا دھوم تو دیکھو

بوڑھے کی شادی سچ مچ کی خانہ آبادی ہوتی ہے گویا اس میں شادی اور خانہ آبادی کی پوری صفات موجود ہوتی ہیں۔ دیکھئے دولھا اور دلھن دونوں جوان، دونوں کے مزاج کڑے، بات بات پر کھٹ پٹ، اس میں شادی کا مزہ ہوتا ہے نہ خانہ آبادی کا۔ لیکن ایک بوڑھے کو دیکھئے، وہ اپنی شادی رچاتا ہے اور اپنے لباس میں، وضع قطع میں، سج دھج میں، یعنی ہر بات میں اپنی گزری ہوئی جوانی کو واپس کھینچ بلاتا ہے۔ جوانی کا واپس آنا شادی نہیں تو اور کیا ہے، اب رہی خانہ آبادی اس میں ایک نوجوان دلھن گھر میں لاتا ہے اور اس کی خاطر مدارات اس قدر کرتا ہے کہ جتنی ایک بوڑھا شوہر ہی اپنی جوان بیوی کی کر سکتا ہے۔ اب بوڑھا شوہر بھی خوش اور جوان بیوی بھی خوش، انصاف کیجئے! اس سے زیادہ شادی خانہ آبادی اور کیا ہو سکتی ہے۔

شادی خانہ آبادی کے فائدے اور نقصان میں کہاں تک عرض کروں، اگر آپ نے شادی نہیں کی تو آپ نے دنیا میں کچھ نہیں دیکھا اور اگر آپ نے شادی کر لی ہے تو دنیا کا صرف تاریک پہلو دیکھا ہے۔ آپ ماشاءاللہ سمجھدار ہیں خود اس معاملے کو سوچ سمجھ لیں۔ اور میری صرف یہ نصیحت مدنظر رکھیں۔

"اگر شادی نہیں کی تو ہرگز مت کیجئے! اور اگر ایک کر چکے ہیں تو دس پانچ اور کیجئے"

دِلّی کے چند شرفا

دلی کے چند شرفا

گزرا ہوا زمانہ جب یاد آتا ہے دل تڑپ جاتا ہے۔ آج سے ۳۵ سال پہلے کی دلی کا نقشہ آنکھوں میں پھر رہا ہے، اس وقت میری عمر مشکل سے پانچ چھ سال ہوگی۔ ان آنکھوں نے اس وقت کیا کچھ دیکھا، آج مطلق یاد نہیں، لیکن پھر بھی اتنا ضرور یاد پڑتا ہے کہ اس وقت کی دلی میں ہر چیز دلکش تھی، اور اتنی دلکش کہ آج ۳۰ سال بعد بھی اسی دلی کو دیکھنے کی آرزو دل کو بے قرار کر دیتی ہے۔

چند سال کے بعد میں پھر دلی گیا، لیکن اس مرتبہ دہلی جانے کا مقصد چند روزہ تفریح نہ تھی، بلکہ مستقل سکونت، ہر چند ان ایام کی یاد بھی ایک نمود غبار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، لیکن تاہم ایک دھندلا سا نقشہ دل و دماغ پر جما ہوا ہے، اور وہ کسی طرح محو نہیں ہوتا، میں قدامت پرست نہیں لیکن ایک حد تک قدامت کا مداح ضرور ہوں، نئے دور اور اس کی دلکشی کا مجھے پورا پورا اعتراف ہے، لیکن پھر بھی پرانی تہذیب کے

اثرات مٹتے ہوئے دیکھ کر دل کچھ خوش نہیں ہیں اکثر سوچا کرتا ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں، کہ اگلے وقتوں کی نشانیاں یونہی قائم رہیں، اور نئی تہذیب کے دلدادہ اپنی طبیعتوں کی جولانیاں دکھلانے کیلئے نئے میدان تلاش کر لیں، آج چاندنی چوک کی سڑک اپنے چوڑے چکلے پن کی وجہ سے قابل تعریف سہی، لیکن مجھے تو اب تک اس کے بیچوں بیچ بہنے والی کیف افزا نہر اکثر یاد آتی ہے، اس کے دونوں کناروں پر گھنے اور سایہ دار درخت کیا بہار دیتے تھے، گھنٹہ گھر کی سربفلک عمارت مجھے محض اس لئے بری معلوم ہوتی تھی کہ چاندنی چوک کی پاک و پاکیزہ فضا میں بالکل بے جوڑ اور انمل نظر آتی تھی، اگر میرا بس چلتا تو ۱۹۰۱ء ہی میں اس بے تکے گھنٹہ گھر کو میں نے منہدم کرا دیا ہوتا۔ میرا طفلانہ دماغ یہ نہیں جانتا تھا کہ چاندنی چوک کی یہ یادگار نہر صفحۂ دنیا سے محو ہو جائے گی اور گھنٹہ گھر اسی طرح قائم رہے گا، مجھے کیا معلوم تھا کہ چاندنی چوک کی نہر تباہ ہو جانے والی مخلوق کی چند روزہ یادگار ہے اور گھنٹہ گھر ایک نورس اور پھلنے پھولنے والی بیل کا شگوفہ،

آج گھنٹہ گھر باقی ہے لیکن نہر کا کہیں نام و نشاں بھی نہیں، چاندنی چوک کی فضا میں ہر وقت موٹروں کی آوازیں گونجتی ہیں۔ اور ہر قدم پر پٹرول کا بھبکا دماغ اڑا دیتا ہے وہ خوانچوں والوں کی دل لبھانے والی سریلی آواز اور ٹھنڈا پانی پلانے والے بہشتیوں کے کٹوروں کی جھنکار خواب و خیال ہو گئی،

سننے والو! مجھ پر مت ہنسو نہیں، میں بھی تمہاری طرح نئے تمدن اور مغربی اثرات سے متاثر ہوں، مجھے بھی آج کل کا طرز بود و ماند پسند ہے لیکن پھر بھی پرانی تہذیب مجھے دلکش معلوم ہوتی ہے، دلی کے پرانی وضع کے مکانوں کا نقشہ میری آنکھوں میں پھر رہا ہے، وہ دائیں بائیں صحنچیاں، بیچ میں دالان در دالان، ان میں سفید براق چاندنی کا فرش، صدر میں مسند اور اس پر گاؤ تکیہ، پاک صاف لوگ ململ کے کرتے، ابر کے پائنچوں کے پاجامے، انگرکھے، اچکنیں، سر پر گول ٹوپیاں، دل میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی ہیں ؎

عاشق نشدی محنتِ الفت نکشیدی

کس پیشِ تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید

آج کل شرافت کا معیار وضع داری کے بدلے دولت قرار پایا ہے ۱۸۵۷ء اور ۱۹۱۲ء کی دلی میں یہ بات نہ تھی، وضع داری ہر کس و ناکس کا ایمان تھا، بزرگوں کے ڈالے ہوئے رسم و رواج پر قائم رہنا ایک آن تھی، جس کی قیمت جان سے بھی زیادہ سمجھی جاتی تھی، میری نظروں میں دلی کا ہر بھلا برا اور چھوٹا بڑا، شرافتِ اصلی کا نمونہ تھا، گلی گلی سودا بیچنے والوں سے لے کر بڑے بڑے دولت مندوں تک ہر شخص اپنی جگہ پر موقر اور معزز نظر آتا تھا، حیران ہوں شرفائے شہر میں سے کس کا ذکر کروں اور کس کا نہ کروں۔ پورے شہر کی آبادی میری نظروں میں قابلِ ذکر ہے، انتخاب کی آنکھیں خیرہ ہیں، بہر حال اس

دھندلی سی تصویریں سے ہیں ان حضرات کے متعلق کچھ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں
جن کے نقوش زیادہ ابھرے ہوئے ہیں،

مجھے سن یاد نہیں، ایک دن چند ہم سبقوں نے کہا، چلو آج مشاعرے میں چلیں، پنڈت امرناتھ ساحر کے مکان پر مشاعرہ ہے، ہم سب پنڈت صاحب کی حویلی میں پہنچے مشاعرہ ہو رہا تھا، دالانوں میں سفید چاندنی کا فرش تھا۔ گاؤ تکیئے قرینے سے لگے تھے، اندر کے دالان میں مسند بچھی تھی، سارا دالان اور صحن نہایت شائستہ افراد سے پُر تھا، مسند پر نواب سعید الدین احمد خاں صاحب طالب رونق افروز تھے، وہی میر مشاعرہ تھے، اچھا نکلتا ہوا قد، بھرا بھرا جسم، سرخ و سفید رنگت، پیری میں جوانی کا جلوہ آنکھوں اور ہونٹوں پر کھیلتا ہوا، ہلکی ہلکی داڑھی، وقار اور تمکنت کی ایک زندہ تصویر، مشاعرہ پورے شباب پر تھا شعرا اپنا اپنا کلام سنا رہے تھے، بڑے سلیقے سے دادِ سخن دی جاتی تھی، اور بڑے لطف سے قبول کی جاتی تھی، جب سب اپنا اپنا کلام سنا کر دل کی بھڑاس نکال چکے تو ایک صاحب نے نہایت ادب کے ساتھ نواب سعید الدین احمد خاں صاحب سے درخواست کی، "حضور آپ بھی اپنا کلام سنائیں۔ سبھی مشتاق ہیں"۔ اس درخواست پر محفل میں ایک خوشی کی لہر سی دوڑ گئی، ہر شخص مصر تھا لیکن اس اصرار میں خوردی اور بزرگی کا احساس واضح اور نمایاں تھا، نواب صاحب نے بتکلف درخواست قبول فرمائی، اور چند تازہ اشعار

نہایت دلکش انداز اور ایک خاص لطف سے تحت اللفظ پڑھے، اس مرصع غزل کے چند شعر مجھے آج تک یاد ہیں مطلع تھا ؎

نظر اس کی پڑتا جو کوئی حسیں ہے — تو دل اپنے قابو کا رہتا نہیں ہے
چلے آتے ہیں تیر مژگاں کے پیہم — نہ ظاہر کماں ہے نہ پیدا کمیں ہے
کسی انجمن میں نہ طالب کو ڈھونڈو — وہ بیچارہ مدت سے گوشہ نشیں ہے

فی الحقیقت نواب صاحب اس زمانے میں گوشہ نشین ہو چکے تھے، صرف شام کے وقت اپنے دولت کدے سے باہر نکلتے، ایک خوبصورت فٹن میں سوار ہو جاتے، ان کی فٹن کی بانکی تیکھی جوڑی کو جو دیکھتا۔ تعریف کرتا۔ اور کہتا نواب سعید الدین احمد خاں سیر کو جا رہے ہیں۔ اکثر قدسیہ باغ اور کمپنی باغ کی سیر کرتے اور واپس آجاتے اسنیما اس زمانے میں نیا نیا چلا تھا، نواب صاحب کو اس سے خاص دلچسپی تھی، اس لئے اکثر سنیما دیکھنے بھی چلے جاتے تھے،

میرے ایک ہم جماعت کے والد نواب صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے ان کی معیت میں اکثر مجھے نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل جاتا تھا۔ نواب صاحب سراپا شفقت بزرگ تھے، آنے جانے والوں کے ساتھ کمال محبت اور اخلاق سے پیش آتے تھے، افسوس وہ باتیں اب کہانیاں ہو گئیں،

اسی زمانے کی دلی میں، ایک اور بزرگ کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے کچھ ان کے متعلق بھی سُن لیجیے۔ مرزا احمد شاہ خاندان مغلیہ کی جیتی جاگتی یادگار ہیں، ان کے والد مرحوم کو دلی کا بچہ بچہ صاحب عالم کے نام سے جانتا تھا، میں نے بھی ان کو دس بارہ برس دیکھا۔ لیکن ان کی سج دھج میں کبھی فرق نہ پایا۔ عمر تو کوئی ساٹھ کے لگ بھگ ہو گی، لانبا قد تھا، کمر جھک گئی تھی، لیکن پھر بھی ان کے شخصی وقار میں ذرہ برابر کمی نہ آئی تھی، وہی شاہانہ رعب داب چہرے سے نمایاں تھا، ایک بار میں اوکھلے کے نواح میں والد صاحب قبلہ کے ساتھ شکار کو گیا، جنگل میں دس بارہ آدمیوں کی ٹکڑی نظر آئی، قریب جا کر دیکھا تو اس گروہ کے سردار صاحب عالم تھے، ٹخنوں دار مغلئی پاجامہ، دریس کا روئی دار دگلا، کمر کسی ہوئی، سر پر مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی، نورانی صورت، گورگانی خاندان کی جیتی جاگتی اور مکمل یادگار،

صاحب عالم کو شکار کا بڑا شوق تھا، باوجود کبر سنی کے اکثر شکار کو تشریف لے جاتے تھے، ہفتہ بھر پہلے شکار کی تیاریاں شروع ہو جاتیں، روانگی کا وقت اور شکار کا مقام مقرر کر لیا جاتا، محلے کے آٹھ دس نوجوانوں کو ساتھ لیا جاتا، شامی کباب تیار کرائے، تنور سے قیمے کے پراٹھے پکواتے، قلاقند بہت مرغوب تھا، موسم کے پھل بھی ساتھ ہوتے، غرض دو تین ناشتے دان اور کئی بھری ہوئی ٹوکریاں ساتھ لے کر صاحب عالم کی سواری

شکار کو روانہ ہوتی، پتہ نہیں زمانے کی سفاکیوں کے اس شکار کو کبھی شکار بھی نصیب ہوُا تھا یا نہیں، بہر حال یہ ضرور ہے کہ اس بہانے سے صاحب عالم اور ان کے ہم رکاب نوجوانوں کی سیر و تفریح خوب ہو جایا کرتی تھی،

صاحب عالم کو کرکٹ دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا، جب ان کے صاحب زادے کے کالج کی ٹیم یا شہزادوں کی کلب کا میچ ہوتا تو صاحب عالم ضرور موجود ہوتے، اور اس قدر انہماک اور دلچسپی سے کھیل کے اتار چڑھاؤ میں محو ہو جاتے، جیسے ان کے آباو اجداد فوج کشی اور ملک گیری کے انتظاموں میں مصروف رہتے تھے۔

جوں جوں عمر بڑھتی گئی، صاحب عالم کی صحت خراب ہوتی گئی، کوئی بارہ چودہ سال ہوئے کہ مغلیہ خاندان کی یہ یادگار تہ خاک دفن کر دی گئی، ؎

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

خاندان مغلیہ کی اس یادگار کا ذکر کرتے کرتے ایک اور بزرگ کی صورت آنکھوں کے سامنے آگئی، اس صوفی منش شہزادے کو عوام مرزا بلاقی کے نام سے جانتے تھے، ویسے ان کا پورا نام شہزادہ حاجی مرزا محمد امیر الملک تھا، ان کے نام نامی سے بہت کم لوگ واقف ہونگے لیکن مرزا بلاقی کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے۔ انہیں شعر و سخن سے

بھی بڑی دلچسپی تھی، خود بھی شعر کہا کرتے تھے، ان کی ابتدائی شاعری کا حال معلوم نہیں، البتہ آخری دور کا کلام اکثر و بیشتر نعتیہ ہوا کرتا تھا۔

شہزادہ مرزا شجاع الملک عرف مرزا الٰہی بخش کے اس فقیر منش بیٹے کا کلام دہلی کے قوالوں میں بہت مقبول تھا، اگر آپ کا گزر کبھی شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مزار یا صابر صاحب کی درگاہ پر ہوا ہے تو آپ نے یقیناً یہ اشعار سنے ہونگے ؎

سن اے بادِ صبا گر جانب طیبہ کبھی گزرے
تو جا کر تھامنا بابِ حریمِ خاص کے پردے
درِ اقدس پہ سر اپنا جھکا کر میری جانب سے
بصد آداب یوں کہنا کہ اے مالک مدینے کے

سبحان اللہ۔ یہ میرزا بلاقیؔ کا کلام ہے، اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے تاریخ گوئی میں مہارت تامہ رکھتے تھے، مرزا صاحب کا کلام "دیوان احقر" اور "ارمغان احقر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اور سرورِ کائنات کے ساتھ ان کے جوشِ عقیدت کی زندہ جاوید یادگار ہے،

مرزا بلاقی کمرہ بنگش کے علاقے میں مختلف مکانات میں رہے، سرکارِ انگریزی سے دس روپے اور ریاست حیدرآباد سے ان کو سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔

وہ جہاں کہیں بھی رہے ان کے ساتھ دو چار غریب مسکین ضرور وابستہ رہے ہیں۔ میرزا صاحب ان کا پورا خرچ برداشت کرتے تھے، ان کے علاوہ محلے کے محتاج اور اپاہج بھی ان کی آمدنی میں برابر کے شریک تھے، جو کچھ بن پڑتا حاجت مندوں کو بے دریغ دیتے۔ خود تکلیف اٹھا لیتے، لیکن دوسرے کی ضرورت کو پورا کر دیتے، کسی آنے جانے والے کو ان کے دروازے پر روک ٹوک نہ تھی، علماء فضلا سے بہت زیادہ صحبت رہتی تھی، منکسر المزاج، خلیق، متواضع اور فقیر نواز صوفی تھے، کہتے ہیں سیّد رحمت علی شاہ سے بیعت تھے اور انہی سے خلافت بھی پائی تھی، لیکن مرید بہت کم کرتے تھے، ان کی باتیں بڑی پرلطف ہوا کرتی تھیں۔ یہی جی چاہتا تھا کہ انسان انہی کے پاس بیٹھا رہے اور ان کی باتیں سنا کرے۔

میرزا بلاقی خوش نویس بھی بہت اچھے تھے، آخری عمر میں بھی ان کے لکھے ہوئے حروف کی نشستیں، پختہ مشق خوشنویس ہونے کی گواہی دیتی تھیں۔ خوشنویسی میں خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ کے شاگرد تھے، ان کے ہاتھوں کو دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ ان ہاتھوں کو ابوظفر بہادر شاہ کے ہاتھوں نے دائروں کی ساخت اور مرکزوں کی گشش کی مشقیں کرائی ہونگی۔

مرزا صاحب نے تقریباً ۹۰ برس کی عمر پائی۔ بارہ سال ہوئے کہ انہوں نے اس

دنیائے ناپائیدار سے کوچ کیا۔ اور اپنے اس جدی گنبد میں دفن ہوئے جو حضرت خواجہ امیر خسرو کے مزار سے چونسٹھ کھمبے کو جاتے ہوئے مسجد کی سیڑھیوں کے پاس بائیں ہاتھ کو واقع ہے،

میری نظروں میں ابھی تک ان کی تصویر پھر رہی ہے۔ گول چہرہ۔ بھری ہوئی لال داڑھی، چھوٹا قد، اکہرا جسم، سانولا رنگ، موزوں خدوخال، لوگوں کی زبانی سنا ہے، جوانی میں پٹھے بھی رکھتے تھے۔ لیکن جب بیت اللہ شریف سے حج کی سعادت حاصل کر کے لوٹے تو پٹھے رکھنے چھوڑ دیئے۔ اردو بولنے والوں نے ان کی یہ نعت کہیں نہ کہیں ضرور سنی ہوگی،

میرے مولا بلالو مدینے مجھے غم ہجر تو دے گا نہ جینے مجھے

جن لوگوں نے یہ نعت بھی سنی ہے اور مرزا بلاقی مرحوم کو بھی دیکھا ہے۔ وہی کچھ اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے تاجداروں کا یہ جانشین، دنیاوی حکومت کھوئے ہوئے خاندان کا فخر، فقر و تصوّف کی قلمرو کا کیسا بلند مرتبہ تاجدار تھا، لباس اور وضع قطع سادہ ہونے کے باوجود ان کی شاہانہ شخصیت کی جھلکیاں دکھاتی تھی، مرزا صاحب عموماً شرعی پاجامہ اور گھٹنوں تک کا نیچا کرتہ پہنتے تھے، اس پر کبھی اچکن کبھی چغہ، اور پاؤں میں اکثر سلیم شاہی جوتی۔ وہ بھی خاص جے پور کی بنی ہوئی،

آخری عمر میں گیروے رنگ کا لباس پہنا کرتے تھے، اللہ اللہ کیا بزرگ تھے، جن کی خدمت میں حاضر ہونا گویا سعادتِ دارین حاصل کرنا تھا،

اب ایک اور بزرگ کا حال سنئے ایک دن میں برادر محترم خان بہادر مولوی ظفر حسن صاحب کے پاس بیٹھا تھا، ایک صاحب کچھ عجیب دھج سے تشریف لائے، تہمد باندھے، بہت نیچا کرتہ پہنے، سر پر اونچی چوگوشیہ ٹوپی، لیکن تمام لباس سر سے پاؤں تک گہرے سرخ رنگ کا۔ سلیم شاہی پھولدار جوتا۔ وہ بھی سرخ، ایک بڑا سا لال رومال ہاتھ میں، چوڑا چکلا چہرہ، اور سرخ رنگت، میانہ قد، چھریرا بدن، اس عجیب وضع کے انسان کو دیکھ کر ایک اچھی خاصی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ میں بڑے غور سے ان کی گفتگو سنتا رہا۔ ان کی لچھے دار باتیں آجتک لطف دے رہی ہیں۔ جب وہ تشریف لے گئے تو میں نے بھائی صاحب سے ان کا اتا پتہ پوچھا، معلوم ہوا کہ یہ حضرت ایک بزرگ انگارا شاہ نام کے مرید ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد یہ بھی انگارا شاہ کہلانے لگے ہیں۔ ان نئے انگارا شاہ کا نام اکرام علی خاں تھا۔ ان کے والد غدر سے پہلے دلی میں منصف تھے اور شرفائے شہر میں بہت ممتاز سمجھے جاتے تھے،

یہ انگارا شاہ عربی فارسی خوب جانتے تھے، حافظِ قرآن بھی تھے، طب بھی پڑھی تھی انگریزی سے بقدرِ ضرورت واقف تھے، اپنے حالات کبھی کبھی خود بھی سناتے تھے فرماتے

تھے ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے کے وقت میں حافظِ قرآن ہو چکا تھا، اس وقت میری عمر کوئی سولہ سال کے قریب تھی،

انگارا شاہ نمک کے محکمے میں انسپکٹر تھے اگرچہ مدت ملازمت ختم ہونے سے پہلے سبکدوش ہو گئے تھے، لیکن کچھ پنشن ملا کرتی تھی، شہر میں کچھ جائداد بھی تھی، ملا جلا کر کل آمدنی کوئی ڈیڑھ سو کے قریب ہو جاتی تھی،

انگارا شاہ نے دہلی کے اکثر عمائدین کی صحبت سے استفادہ کیا تھا، حکیم محمود خاں صاحب اور مرزا غالب کی خدمت میں اکثر حاضر رہا کرتے تھے، میں کرید کرید کر مرزا غالب کی باتیں ان سے پوچھا کرتا تھا، اور وہ بڑے شوق سے بیان فرمایا کرتے تھے،

فرماتے تھے، ایک روز شام کے وقت شیخ ابراہیم ذوقؔ حضرت ابو ظفر بہادر شاہ بادشاہ اعلی اللہ مقامہٗ کے ساتھ لال حویلی کے بائیں باغ ساون بھادوں میں گل گشت کر رہے تھے، مرزا غالب بھی وہیں موجود تھے، وہ بادشاہ سلامت سے ذرا بچ کر ایک طرف کو ہو گئے، اور استاد ذوقؔ کے قریب سے یہ مصرع گنگناتے ہوئے گزرے :-

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

استاد ذوقؔ نے پیر و مرشد کو اس مصرع کی طرف متوجہ کیا، حضور نے اسے اپنے استاد پر چوٹ سمجھتے ہوئے مرزا غالبؔ کو مخاطب کیا، اور ارشاد فرمایا بھئی آپ کیا گنگنا رہے ہے

تھے، مرزا صاحب نے دست بستہ عرض کیا۔ جہاں پناہ ایک مقطع پڑھ رہا تھا۔ حضور نے فرمایا، بھئی ہم بھی سنیں وہ کیا تھا۔ مرزا غالب نے عرض کیا۔ حضور

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِترا تا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ مرزا جس غزل کا یہ مقطع ہے اس کے کچھ شعر بھی سناؤ۔ مرزا صاحب موقع کی نزاکت کو سمجھ گئے ملہم غیبی کی تائید شامل حال تھی، اسی وقت یہ چند اشعار فی البدیہہ عرض کئے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ برق میں یہ کرشمہ نہ شعلے میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اترا تا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

انگار اشاہ جمعرات کے دن بلاناغہ حضرت کلیم اللہ جہاں آبادی کے مزار پر انوار پر حاضر ہوا کرتے تھے، کبھی فاتحہ سے پہلے اور کبھی مغرب کے بعد برادر محترم ظفر حسن صاحب کے ہاں تشریف لاتے تھے، مینہ جائے آندھی آئے، اس وضع میں فرق نہ آتا تھا، کئی سال تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ کیا کیا باتیں ان کی زبان سے نہیں سنیں،

انگار اشاہ نے مرنے سے کئی سال پہلے چونسٹھ کھمبے کے سامنے حضرت نظام الدین اولیاء کے زیر سایہ اپنا سردابہ بنوا لیا تھا، یہ دلی کے شرفا کی رسم تھی، ایک دن میں نے شاہ صاحب سے کہا حضرت آج سے پچاس سال بعد محکمۂ آثار قدیمہ کو آپ کی تاریخ وفات کے تعین میں آپ کے سردابہ کا کتبہ بہت دھوکا دیگا۔ یہ سن کر وہ متانت سے مسکرائے، اور فرمایا۔ میاں ہم سے اکتاتے کیوں ہو، ہم آج ہیں تو کل نہیں، سن لینا کسی دن چل بسیں گے میں یہ جواب سن کر بہت پچھتایا، عجیب اتفاق ہے اس واقعے کے چند مہینے بعد انگار اشاہ صاحب اپنے محلۂ ردوگراں والے دنیاوی دولتکدے کو چھوڑ کر چونسٹھ کھمبے والے

عشرت کدے میں جا سوئے ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا،

آئیے اب ایک اور صاحب سے آپ کی ملاقات کراؤں، جامع مسجد کے شمالی دروازے سے چتلی قبر کو جانے والی سڑک سے دائیں ہاتھ کو مڑ جائیے سو پچاس قدم چل کر

ایک راستہ بائیں ہاتھ کو پھٹتا ہے، اور ٹوکری دالان میں سے ہوتا ہوا چوڑی دالان میں جا نکلتا ہے۔ ٹوکری دالان کے نکڑ پر پان کے دریبہ کے پاس آٹھ دس دکانیں کباڑیوں کی ہیں۔ یہ دکانیں بظاہر بے ترتیب اور پریشان ہیں۔ لیکن اکثر کباڑیئے یہاں ایسے ہیں جو پرانی کتابیں بیچتے ہیں۔ ان کے پاس بڑی بڑی پرانی مطبوعہ اور قلمی کتابیں اور دہلی کے اُجڑے ہوئے گھرانوں کے نوادرات بھی مل جاتے ہیں۔ شام کے وقت، یہاں ایک بزرگ اکثر پھرتے چلتے نظر آتے ہیں۔ ستر بہتر برس کی عمر، ململ کا کرتہ، سیدھی موری کا پاجامہ، سر پہ دو پلڑی ٹوپی، پاؤں میں سادی نری کی سلیم شاہی جوتی، اور ہاتھ میں چھڑی، لیجئے وہ چلے آرہے ہیں! کمر جھکی ہوئی، رنگ کھلتا ہوا گندمی، ذرا بھرا بھرا چہرہ، خشخشی داڑھی، آنکھیں نہ بڑی نہ چھوٹی، مسکراتی ہوئی صورت، دوہرا بدن، ہلکے ہلکے قدم اٹھاتے ہوئے ایک دکان سے اٹھ کر دوسری دکان پر جارہے ہیں۔ آپ نے سنا ایک کباڑیئے نے انہیں ڈپٹی صاحب کہہ کر آواز دی، یہ پرانی کتابوں کے عاشق ہیں، کباڑیئے بھی منہ مانگے دام لیتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اکثر کتابیں انہی کے کتب خانے کی ہوتی ہیں۔ لڑکے بالے چرا کر لے آتے ہیں اور کباڑیوں کے ہاتھ بیچ جاتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب انہیں پھر خرید لیتے ہیں۔ اور لے جا کر زیادہ حفاظت سے رکھ دیتے ہیں،

افسوس صد افسوس یہ بزرگ بھی ۳۴ء میں اس دنیا سے اٹھ گئے، وہ کیا اٹھے

ان کے ساتھ وضعداری دلی سے اٹھ گئی،

دلی کے اس دور کے شرفا کا ایک ہجوم پیشِ نظر ہے، جی چاہتا ہے ایک ایک سے ہاتھ ملاؤں، ایک ایک کے قدم لوں، ایک ایک سے بات چیت کروں، ؎

کسے کہ محرمِ بادِ صباست می داند
کہ باوجودِ خزاں بوئے یاسمن باقیست

"دلی کے چند مصنّفین"

دلی کے چند مصنّفین

میرا قلم سست اور میری زبان گنگ، لیکن میرے دل میں دلی کے چند مصنفین کی یاد اس قدر تازہ ہے کہ اس کی قلمی تصویر بنانے کے لئے شوخیٔ تحریر اور رعنائیٔ تقریر کی ضرورت نہیں۔ میں نے ان باکمالوں کی نورانی صورتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اور ان میں سے اکثر کی خدمتِ اقدس میں حاضر بھی ہوا ہوں۔ نواب شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ۔ مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ۔ علامہ راشد الخیری۔ سید جالبؔ۔ خواجہ ناصر نذیر فراقؔ۔ مولوی بشیر الدین احمد۔ میر باقر علی داستان گو۔ ڈاکٹر محمد اسماعیل ذبیحؔ۔ اور آغا شاعرؔ قزلباش کی نورانی صورتیں اس طرح آنکھوں میں پھر رہی ہیں، جیسے یہ سب باکمال دہلی میں موجود ہیں۔ اور میں ان کی خدمت میں حاضر،

ان باکمالوں میں کوئی شاعر ہے اور کوئی نثر نگار۔ کسی نے لغت مرتب کی ہے اور کوئی داستان گوئی میں یگانۂ روزگار۔ شرافت اور نفاست کی قبا ان بزرگوں کے جسموں پر

راست ہے، علم و ادب کی پرستاری اور خدمت گزاری ان کا شیوہ ہے۔ کیسے سیدھے سادے اور خوش فکر لوگ ہیں ؂

وہ سیدھی ان کی وضع وہ اخلاق دل پسند

ایسوں کو آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں اس زمانے میں

نقّاد ان کے کلام اور بیان پر تنقید نگاری کرینگے۔ ادب کی تاریخ میں ان کے نام سنہری حرفوں میں لکھے جائینگے۔ لیکن مجھے نہ نقد و نظر کا دماغ نہ سوانح نگاری کی فرصت۔ میں تو صرف ان کے پر نور چہروں سے نقاب اٹھا کر آپ کو ان کے شخصی خد و خال کی جھلک دکھانا چاہتا ہوں، افسوس اس مختصر سی مہلت میں یہ ممکن نہیں کہ جن باکمالوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان سب کی خدمت میں آپ کو بھی لے چلوں، البتہ یہ ممکن ہے کہ اس رواروی کے عالم میں دو چار سے آپ کی روشناسی ہو جائے،

لیجے حویلی خان دوران کی پشت پر جو راستہ کلاں محل کو جاتا ہے اس پر میرے ساتھ چلئے۔ سیدھے ہاتھ کو ایک کشادہ سی گلی ہے۔ اس میں مڑ جائیے۔ کوئی دس قدم پر "تمدن" کا دفتر ہے یہیں مولانا راشد الخیری رہتے ہیں۔ میں اور اُن کے صاحب زادے رازق الخیری عربک سکول میں پڑھتے ہیں۔ میں کھڑا رازق کو پوچھ رہا ہوں۔ اتنے میں ایک بزرگ، درمیانہ قد، بھاری بدن۔ دبتی ہوئی سانولی رنگت، کٹے کٹے مختصر سے جملے بولتے ہوئے

سامنے آگئے۔ اور بولے کسے پوچھتے ہو؟ صاحب زادے! اچھا اچھا رازق میاں کو؟— یہی صاحب علامہ راشد الخیری ہیں جنہیں اردو بولنے والے مصوّرِ غم کہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ رسم و راہ بڑھ گئی۔ اور روشناسی نیازمندی کی حد تک پہنچ گئی۔ سال کے بعد سال آیا اور گزر گیا۔ مولوی صاحب کے بال پک گئے، داڑھی سفید ہو گئی۔ مگر سج دھج وہی رہی۔ نہ کبھی کرتے قمیص کا گریبان بند ہوا نہ کبھی شیروانی کے بٹن لگے، اور نہ کبھی سر کے بالوں اور داڑھی میں کنگھی ہوئی، مگر طبیعت کی شادابی ہمیشہ ایک سی رہی۔ منکسر مزاجی میں کبھی فرق نہ آیا، زنانہ لٹریچر اور رسالے اسی تن دہی سے نکالتے رہے، اور ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد ان کے ہم خیال ہو جائیں،

؁۲۴ء کے بعد مولوی صاحب اپنے قدیمی مکان سے اٹھ کر دریا گنج میں پھول منڈی کے قریب والے مکان میں آرہے تھے، شام کے وقت اکثر اپنے ایک دو دوستوں اور نیازمندوں کے ساتھ سڑک پر ٹہلا کرتے تھے۔ جب کسی بے تکلف شخص سے مڈھ بھیڑ ہوتی بے ساختہ لڑکیوں کے نصاب کی ترتیب و تدوین کا ذکر چھیڑ دیتے۔ اس گفتگو میں تسلسل کم ہوتا تھا۔ لیکن ان کا طبعی رجحان بے لاگ ظاہر ہو جاتا تھا۔ علامہ راشد الخیری انتقال فرما گئے۔ لیکن ان کے ادبی کارنامے زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے ؏

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

لیجئے اب کمرہ بنگش کی طرف چلئے۔ دیکھئے یہ بائیں ہاتھ کو گلی مڑ گئی۔ یہی بارہ دری خواجہ میر درؔد ہے، یہاں وہی خواجہ میر درؔد رہتے تھے۔ جن کے احسان سے اردو شاعری کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ خواجہ میر درؔد کے نواسے سید ناصر نذیر فراقؔ یہیں رہتے ہیں۔ یہ مغلئی دلی کی سچی یادگار ہیں۔ اور کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان لکھتے ہیں۔ نہایت باوضع اور با اخلاق بزرگ ہیں، ہر کس و ناکس سے خندہ پیشانی اور شفقت سے پیش آتے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں ان کا رتبہ بہت اونچا ہے، خدمتِ خلق کے لئے مطب بھی کرتے ہیں۔ دلی والے انہیں خواجہ میر درد کا جانشین کہتے ہیں۔ بھاری بھر کم جسم، پر رعب چہرہ۔ سانولا سلونا رنگ، متشرع داڑھی، وہی پرانی وضع کا سیدھا سادا لباس، ہمیشہ مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔ گھر سے بہت کم نکلتے ہیں۔ جائیں کہاں ملنے والے ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے، خود بھی چراغ سحری ہیں،

اگلے وقتوں کے لوگوں کی طرح آپ بیتی خوب درد سے سناتے ہیں۔ کہتے ہیں علوم فارسی و عربی اور طب میں نے سولہ سال کی عمر میں ختم کر لئے تھے، لیکن شعر موزوں نہ ہوتا تھا۔ اس بات پر والد ہمیشہ طعنہ دیا کرتے اور کہتے ہمارے خاندان میں ایک تم ہی ایسے ہوئے ہو۔ یہ سن کر ہم کھسیانے ہو جاتے اور شعر موزوں کرنے کی کوششیں کرتے۔ لیکن پھر بھی شعر موزوں نہ ہوتا۔ اتفاق کی بات اسی اثناء میں ہماری بیوی اللہ کی پیاری ہوئیں۔ صرف

ایک سال شادی کو ہوا تھا، دل پہ سخت صدمہ گزرا۔ اور دیوانگی کا عالم طاری ہو گیا۔ خدا کی قدرت، اس صدمے سے خیالات میں رعنائی اور طبیعت میں موزونی آگئی،"

"والد کو جس قدر اپنی بہو کے مرنے کا صدمہ تھا۔ اسی قدر میری شعر گوئی کی خوشی تھی اس کے بعد انہیں یہ شوق ہوا کہ مجھے کسی کامل استاد کا شاگرد کرا دیں۔ چنانچہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزادؔ کا نام نامی تجویز ہوا۔ مولانا ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے، مجھ سے شرف تلمذ بخشنے کی درخواست لکھوائی گئی۔ اور میں نے کمال شوق اور آرزومندی سے لکھی، اتفاق دیکھئے میری درخواست مسترد ہو گئی، لیکن قسمت کی خوبی، چند ماہ بعد حضرت آزادؔ دلی تشریف لائے، اور نواب پٹودی کی کوٹھی میں فروکش ہوئے، والد کو بھی خبر ہو گئی، دن ڈھلے، مجھے ساتھ لے کر حضرت آزادؔ کی خدمت میں پہنچے، والد مرحوم نے میرا سر حضرت آزادؔ کے قدموں میں رکھ دیا۔ اور فرمایا حضرت یہ سر ایک حسینی سید زادے کا ہے، اس کی لاج رہے، اس جملے کو سن کر مولانا کانپ اٹھے، اور مجھے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ "آپ نے یہ کیا غضب کیا"، مولانا نے فرمایا "ہم تو آپ کے بزرگوں کا کلمہ پڑھتے ہیں"۔ والد نے کہا "حضرت غضب تو آپ نے کیا کہ ایک کمسن سید زادے کا دل توڑا، اور صاف لکھ دیا ہم تمہیں شاگرد نہیں کرتے"۔ مولانا نے فرمایا۔ "واللہ مجھے بالکل یاد نہیں"، والد نے ان کا کارڈ جیب سے نکال کر دکھایا۔ مولانا نے خط پڑھ کر کمال افسوس

ظاہر کیا۔ اور فرمایا "حضرت میر صاحب مجھے جو آلِ رسول کے ساتھ محبت ہے، اسے خدا ہی خوب جانتا ہے، اس وقت ایک تو میں عدیم الفرصت تھا، دوسرے مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کے کاتب سید زادے ہیں۔ برائے خدا آپ مجھے معاف فرمائیں میں جب تک جیونگا اس بے پروائی کی تلافی کرتا رہونگا۔ اگر میاں ناصر نذیر اپنا کلام لائے ہیں۔ تو بلا تکلف دکھائیں" خواجہ صاحب کہتے ہیں، یہ سن کر میں نے اپنا کلام جیب سے نکالنا چاہا، لیکن والد نے اشارے سے منع کر دیا اور اپنے ملازم کو چپکے سے کہا "دو روپے کی خرمیاں لے آؤ" جب مٹھائی آئی تو مولانا نے فرمایا "اس تکلف کی کیا ضرورت تھی"، والد نے کہا "یہ تکلف نہیں تبرک ہے"، مولانا نے اس پر جناب مدینتہ العلم کی نیاز دی اور حاضرین کو بانٹ دی، پھر میں نے اپنا کلام خود پڑھ کر سنایا۔ مولانا نے قلم اٹھا کر نہایت برجستہ اصلاح دی، اور فرمایا "لیجے میر صاحب اب میرے اوپر لازم ہو گیا کہ میں اس سید زادے کو آزاد ثانی بنا دوں"

خواجہ صاحب بار بار فرمایا کرتے ہیں "اگر میری قسمت سے استاد کا دماغ نہ الٹ جاتا تو مجھے وہ دوسرا آزاد ہی بنا دیتے، افسوس یہ اصلاح کا سلسلہ برسوں جاری رہا۔ لیکن یہ وقت آنکھ جھپکنے میں گزر گیا"

اگر کوئی شخص خواجہ صاحب کی نظم و نثر کی تعریف کرتا ہے تو کمال انکسار سے فرماتے

ہیں "میاں میں جانتا ہوں، مجھ کو نظم و نثر لکھنے کا سلیقہ نہیں، لیکن الحمداللہ بے استاد نہیں ہوں۔ ایک کامل استاد کا دامن میرے ہاتھ میں ہے"،

افسوس حضرت ناصر نذیر فراق کا انتقال ہو گیا، لیکن اُن کی پُر لطف اور شائستہ باتیں ابھی تک اسی طرح کانوں میں گونج رہی ہیں، ع

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

چلئے اب آگے چلیں، اور آپ کی ایک اور بزرگ سے یاد اللہ کرائیں۔ چتلی قبر سے بائیں ہاتھ کو مُڑ چلئے، دیکھئے یہ بھوجلہ پہاڑی ہے، یہاں کشمیریوں کی گلی میں ہندوستان کے قابل فخر داستان گو میر باقر علی رہتے ہیں۔ بڑے خوش اخلاق اور پابند وضع بزرگ ہیں۔ طب حکمت موسیقی، تاریخ۔ نجوم، اور خدا جانے کن کن علوم پر عبور ہے، اگر ان کو ہر فن مولا کہیں تو بجا ہے، لیکن داستان گوئی میں انھوں نے وہ شہرت حاصل کی ہے کہ اس کے سامنے ان کے دوسرے کمالات ماند پڑ گئے ہیں۔ کہنے کو منہ سے بات کہتے ہیں لیکن سننے والوں کی آنکھیں سنیما دیکھنے لگتی ہیں۔ شیریں بیانی ان پر ختم ہے، داستان میں اگر ہتھیاروں کا ذکر آجاتا ہے تو گویا آپ دنیا کے سب سے بڑے اسلحہ خانے میں پہنچ جاتے ہیں سبحان اللہ ان کی تقریر میں مزاح تفنن اور خوش دلی کی وہ چاشنی ہوتی ہے کہ چھوٹے بڑے یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں،

کئی سال ہوئے میر صاحب کی داستانِ حیات ختم ہوگئی۔ اور ان کے ساتھ داستان گوئی کا فن ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے اُٹھ گیا،

آئیے اب آپ کی ایک اور بزرگ سے ملاقات کرائیں، یہ حوض قاضی کے پاس گلی شاہ تارا میں رہتے ہیں۔ ان کا اسم گرامی ہے مولوی سید احمد صاحب اگر آپ ان کے نام سے واقف نہیں، تو ان کی مشہور تالیف فرہنگِ آصفیہ سے ضرور واقف ہونگے یہ لغت دلی کی اصلی زبان کی فرہنگ ہے، مرحوم نظام عالی مرتبت نے اس کی بڑی قدر فرمائی اور مولوی صاحب کا تاحین حیات وظیفہ مقرر کردیا مولوی صاحب کا قد درمیانہ ہے، اور جسم خوب بھاری، کام بہت کرتے ہیں اور چلتے پھرتے کم ہیں۔ سر پر ترکی ٹوپی ہوتی ہے، اور اس کا پھندنا ہمیشہ ماتھے پر لٹکتا ہے، اچکن پہنتے ہیں، گول بھری بھری ڈاڑھی ہے اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں، جو ہمیشہ خراب رہتی ہیں۔ نہایت ثقہ اور متین بزرگ ہیں۔ لیکن جب بے تکلف دوستوں میں بیٹھتے ہیں تو بات بات پر منہ سے پھول جھڑتے ہیں،

مولوی صاحب نے اچھی خاصی عمر میں نئی شادی کی شمس العلماء میر ممتاز علی ان کے بے تکلّف دوست تھے، انھوں نے فرمایا، بھائی اس بڑھاپے میں یہ تم نے کیا گل کھلایا، مولوی صاحب نے جواب دیا، واہ میر صاحب واہ۔ بھلا آپ اس رمز کو

کیا سمجھیں۔ نکاح کے بعد جب زنان خانے میں میری طلبی ہوئی تو ایک شخص نے ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر آواز دی، پردہ کر لینا۔ لڑکا اندر آتا ہے، اس وقت میرا خون پلیوں ہی تو بڑھ گیا، حضرت میر صاحب، نہ ہم شادی کرتے نہ لڑکے کہلاتے، شادی کے طفیل نئی جوانی کیا لڑکپن بھی واپس آ گیا،

چلئے یہیں سے گلی قاسم جان میں نکل چلیں، یہ علاقہ پرانی دلی کا دل ہے، دس پانچ بزرگ یہاں ایسے ملیں گے کہ عقیدت مندوں کی آنکھیں ان کے نورانی چہروں پر جم کر رہ جائیں گی، وہ دیکھئے ایک بزرگ بڑے لحیم شحیم۔ بلند بالا۔ گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، ہنستا ہوا چہرہ، جھومتے جھامتے چلے آتے ہیں۔ ادھر ادھر کی دکانوں والے اور آتے جاتے لوگ انہیں تسلیم و آداب کر رہے ہیں، ان کی حویلی سے حکیم اجمل خاں کے دولتکدے تک تھوڑا سا فاصلہ ہے، لیکن پندرہ منٹ لگا دیئے، کئی جگہ رُکے، کتنوں ہی سے باتیں کیں، ذرا سننا۔ اونچی آواز سے بول رہے ہیں۔ ہائیں یہ کیا غیر ثقہ گفتگو ہے، انہیں کون نہیں جانتا۔ لوگ ان کی باتیں سننے کو ترستے ہیں۔ آخر یہ ہیں کون بزرگ؟ یہ نواب شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ ہیں ؏

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آئیے ایک شاعر سے اور ملیں، چلئے میرے ساتھ کشمیری دروازے چلئے

اور حضرت آغا شاعر قزلباش سے ملیئے۔ سنئے صاحب جن لوگوں نے آغا شاعر کو جوانی کے عالم میں دیکھا ہے وہ اب ان کو پہچان بھی نہیں سکتے، بھاری بھرکم جوانی سے بھرپور جسم۔ قابل رشک صحت، خمار آلود بڑی بڑی آنکھیں، سرخ و سفید رنگت، نہایت شاندار چڑھی ہوئی مونچھیں، صاف داڑھی، سر پر مشہدی لنگی وہ بھی ایک خاص انداز سے بندھی ہوئی، کبھی سوٹ بوٹ کبھی افغانی شلوار، راہ چلتوں کی نظریں انہی پر پڑتی تھیں، جس زمانے میں ان کا شباب تھا۔ ان کی شاعری بھی شباب پر تھی، دلی کا بچہ بچہ ان کے شعر گاتا پھرتا تھا، ہندوستان کے گوشے گوشے میں ان کی شاعری کا چرچا تھا، قدر دان ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے،

آغا صاحب کا شعر خوانی کا انداز بھی جداگانہ تھا، اگرچہ تحت اللفظ پڑھتے تھے لیکن ان کے بعد گا کر پڑھنے والوں کا بھی رنگ نہ جمتا تھا، شعر کیا پڑھتے شعر کی تصویر کھینچ دیتے تھے،

ان کی زندگی کے آخری ایام بے کسی اور بے بسی کی عبرت ناک تصویر ہیں۔ آئیے فیصلوں میں مڑ چلیں، وہ صبح شام اکثر یہیں ٹہلا کرتے ہیں۔ لیجیے دیکھ لیجیے، یہ حضرت آغا شاعر قزلباش ہیں۔ اف کیسی بری حالت ہے، ان سے بات نہ کیجئے گا، نہیں تو بچوں کی طرح رونے لگیں گے، دیکھئے ہاتھ پاؤں پر سوجن ہے، اختلاج قلب

کے مریض ہیں، معدہ اور جگر بالکل بیکار ہو چکا ہے، ان کا حال تو دیکھا نہیں جاتا، کس قدر پریشان ہیں، ارے صاحب جن لوگوں نے آغا صاحب کے عروج کا زمانہ دیکھا ہے وہ ان کی موجودہ حالت کو دیکھ کر رو دیتے ہیں، کہاں وہ آغا شاعر جو محفلوں کا سنگار تھا۔ اور کہاں وہ آغا شاعر جو کس مپرسی کے عالم میں نیم جانوں کی طرح گردن ڈالے، گریبان چاک۔ ننگے سر، ننگے پاؤں خراماں خراماں چلا جاتا ہے اور اپنے اس شعر کی تصویر آپ بن گیا ہے،

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

افسوس آسمان شاعری کا یہ درخشندہ ستارہ جو ایک مدت سے مصائب و آلام کی بدلیوں میں جھلملا رہا تھا، ۱۲ر مارچ ۱۹۴۰ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

دلی کے چند حکیم

دلی کے چند حکیم

دلی بھی کیا مقام ہے۔ نام لینے سے جان آتی ہے۔ چلیئے چاندنی چوک کی سیر کریں۔ اس کی بہاروں میں ٹھٹکنے کا سماں نہیں۔ اس کی رعنائیوں پہ محو ہو جانے کا موقع نہیں۔ اس کی چہل پہل میں کھو جانے کا وقت نہیں۔ یہ لیجیئے فوارہ آگیا۔ یہ سنہری گنبدوں والی مسجد سنہری مسجد کہلاتی ہے۔ نادر شاہ بادشاہ نے قتل عام کا حکم اسی مسجد میں پہنچ کر دیا تھا۔ حکم کیا دیا تھا۔ آدھی تلوار نیام سے باہر نکال کر سیڑھیوں پہ بیٹھ گیا تھا۔ اس تباہی سے بے چاری دلی مدتوں نیم جان رہی۔ قدم اٹھائیے۔ اور آگے بڑھے چلیئے۔ یہ دیکھیئے گھنٹہ گھر آگیا۔ لیکن یہ عمارت ہی مذاق سلیم پر بار ہے۔ یہاں تو سانس لینا بھی دشوار ہے آگے چلیئے۔ لیجیئے۔ یہ بائیں ہاتھ کو رحمٰن کا کوچہ ہے۔ کہتے ہیں۔ اس کا اصلی نام رائے امان کا کوچہ تھا۔ ہوتے ہوتے رحمان کا کوچہ بن گیا۔ یہ راستہ بھی بلی ماروں میں جا نکلے گا لیکن ہم گلیوں کے موڑ توڑ میں کیوں الجھیں۔ سامنے ہی تو بلی ماروں کا محلّہ ہے۔ وہ دیکھیئے۔

دائیں ہاتھ کو نیل کا کٹرہ ہے اور بائیں ہاتھ کو بلی ماروں کا بازار۔ اچھا خاصا بڑا بازار ہے۔ لیکن چاندنی چوک کے مقابلے میں ایک تنگ گلی۔ خوب پُر رونق ہے۔ گھوڑا گاڑی شکرم۔ فٹن۔ یکے۔ تانگے۔ ڈولیاں، پالکیاں۔ نالکیاں، ادھر ادھر جا رہی ہیں معلوم ہوتا ہے۔ میلا لگا ہے۔ شہریوں کے علاوہ پردیسیوں کی بھی کثرت ہے۔ کوئی مشہدی لنگی باندھے پھر رہا ہے۔ کسی کا ڈھیلا ڈھالا کرتہ ہے۔ کسی کی واسکٹ میں سیکڑوں سیپ کے بٹن ٹنکے ہیں۔ سرحدی شلواریں اور پشاوری جوتے پہنے قوی ہیکل ولائتی اہلے گہلے پھرتے ہیں۔ پنجابی بھی کثرت سے ہیں۔ دکنی بھی ہیں اور سندھی بھی۔ بنگالی بھی ہیں اور گجراتی بھی، ہندو سکھ عیسائی مسلمان غرض ہر قوم کے لوگ اس بازار میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اس بازار میں عطاروں کی دکانیں قدم قدم پر ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ہر دکان پر بھیڑ بھاڑ ہے۔ کوئی سو پچاس گز اور چلے چلیئے۔ یہ دیکھیئے! آپ کے دائیں ہاتھ کو گلی قاسم جان ہے اور بائیں ہاتھ کو ایک سفید محراب دار پھاٹک، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اس پھاٹک کے اندر کوئی چشمۂ شیریں ہے مخلوق کی آمد و رفت کا ایک تانتا بندھا ہوا ہے۔ اس عمارت کا نام "شریف منزل" ہے۔ بڑے حکیم صاحب یعنی حکیم اجمل خاں صاحب کا مطب یہیں ہے۔ حکیم صاحب ہندوستان کے بو علی سینا بلکہ مسیحا ہیں۔ بڑے بڑے مایوس العلاج مریض آتے ہیں۔ اور خاک کی چٹکی سے شفا پاتے

ہیں۔ آئیے ذرا ان کے مطب کا نقشہ بھی دیکھیں،

یہ دیکھئے دالان در دالان۔ دودھ جیسی سفید چاندنی کا فرش اس پر ایرانی اور افغانی قالین۔ باہر کے دالان کی آخری محراب میں حکیم صاحب تشریف فرما ہیں۔ پیچھے گاؤ تکیہ دھرا ہے۔ پہلو میں قیمتی ادویات کا بکس رکھا ہے۔ دونوں دالان مریضوں سے بھرے ہیں۔ حکیم صاحب کے دائیں بائیں کتنے ہی شاگرد بیٹھے ہیں۔ دیکھئے اس پُر رعب شخصیت سے ہر شخص مرعوب ہے۔ رنگ بہت کھلتا ہوا گندمی۔ بلکہ گورا۔ قد درمیانہ سا۔ بڑی بڑی پُر رعب آنکھیں سیاہ داڑھی۔ نگاہیں نیچی۔ آواز بہت ملائم۔ بلکہ زیر لب۔ مطب میں کس غضب کی خاموشی ہے۔ دھکا پیل نہیں۔ افراتفری نہیں۔ سب اپنی اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ باری باری ادب سے آگے بڑھتے ہیں۔ حکیم صاحب نبض دیکھتے ہیں۔ مریض اپنا حال کہتا ہے۔ وہ ایک آدھ ضروری سوال کرتے ہیں۔ پھر پیشکاروں سے نہایت دھیمی آواز میں کچھ کہتے ہیں۔ جسے وہی سمجھتے ہیں۔ پیشکار نسخہ لکھ کر حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ حکیم صاحب اسے ملاحظہ فرما کر مریض کو دے دیتے ہیں۔ اسی گھاس پات اور پھل پھول سے اللہ شفا دیتا ہے،

حکیم صاحب بڑے خلیق اور ہر دل عزیز ہیں۔ ہر آنے جانے والا یہی سمجھتا ہے کہ مجھ پر ان کے خاص الطاف و اکرام ہیں۔ وہ شؔہید تخلّص کرتے ہیں۔ لیکن

حقیقت یہ ہے کہ دلی کا بچہ بچہ ان پر شیدا ہے۔

سنئے۔ آپ کو ایک واقعہ سنائیں ۱۹۱۹ء میں دلی میں ہڑتال ہوئی۔ ان دنوں خلافت اور کانگرس کا بڑا زور تھا۔ اور حکیم صاحب ان تحریکوں کی روح رواں تھے، ہڑتال کے باعث شہر بالکل سونا پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڑا ہنگامہ ہونے والا ہے چیف کمشنر نے لال قلعہ میں ایک میٹنگ کی۔ اور ضروری معاملات پر غور کرنے کے لئے حکیم صاحب کو بھی بلایا۔ ادھر حکیم صاحب تو قلعہ میں تشریف لے گئے۔ ادھر شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حکیم صاحب کو دھوکے سے بلا کر قلعہ میں نظر بند کر لیا ہے۔ اس خبر کا اڑنا تھا کہ شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ اور مخلوق لال قلعے کے سامنے جمع ہونے لگی،

ہمارے ہاں ایک عورت مریم نام ملازم تھی۔ اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کو ہم لوگ ہوچو ہوچو کہا کرتے تھے۔ اس ہوچو نے جب یہ سنا کہ حکیم صاحب کو گرفتار کر لیا گیا ہے تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور چولھے میں سے ایک سلگتی ہوئی لکڑی نکال کر قلعے کی طرف بے تحاشا بھاگا۔ ہر چند ہم سب نے شور مچایا کہ ہوچو کیا کرتا ہے۔ کہاں جاتا ہے لیکن اس نے ایک نہ سنی،

ہائے کیا مخلوق تھی۔ اور کیسے محبت والے لوگ تھے۔ اب یہ باتیں افسانہ ہو گئیں

چودہ سال ہوئے کہ حکیم صاحب ۱۹۲۷ء میں اس دنیا سے سدھار گئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہے،

مجھے اس خاندان سے بڑی عقیدت ہے۔ حکیم اجمل خاں کے بعد حکیم بھورے خان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ وہ بھی اپنی وضع کے خاص طبیب تھے۔ اور حق یہ ہے کہ اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ انہوں نے بھی بڑے معرکے کے علاج کئے۔ جن کے چرچے خاص و عام کی زبانوں پر ہیں لیکن میری یادداشت میں سب سے زیادہ نمایاں نقوش حکیم بھورے خاں کی محبت اور دوست پرستی کے ہیں۔ وہ بلند ہمت شخص دوست اور دشمن پر یکساں احسان کرتا اور اپنے عزیزوں پر جان دیتا تھا۔ اس کے تعلقات تصنع سے پاک تھے۔ وہ دوستوں کی ضروریات پر ہزاروں روپیہ بے دریغ صرف کر دیتا لیکن کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہوتی،

حکیم بھورے خاں جاڑے میں بھی تن زیب ہی پہنا کرتے تھے۔ گرم کپڑا بہت کم استعمال کرتے تھے۔ عربی، فارسی پر پورا عبور تھا۔ انگریزی اگرچہ اپنے شوق سے پڑھی تھی مگر اتنی استعداد بہم پہنچا لی تھی کہ مشکل سے مشکل انگریزی کتابیں پڑھ لیتے تھے،

کوئی پانچ چھ سال ہوئے حکیم بھورے خاں بھی اس دنیا سے اٹھ گئے۔ وہ کیا اٹھے ان کے ساتھ طب یونانی اور دوست نوازی کا بھی خاتمہ ہو گیا،

اسی باعظمت خاندان کے فضل وکمال کا نمونہ حکیم محمد احمد خاں بھی تھے افسوس ان کا بھی انتقال ہو گیا،